عرض احوال

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

حقوقِ نسواں بل؟

حدود آرڈی ننس کی جگہ حکومت کی جانب سے پیش کردہ حقوقِ نسواں بل کا مقصد نام نہاد اسلامی دانشوروں کی مغرب نواز تجاویز کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ حدود آرڈی ننس میں ترمیم کی ضرورت حکومت کو کیوں اس شدت کے ساتھ محسوس ہوئی ہے' سب جانتے ہیں کہ یہ اس امریکی ایجنڈے کا حصہ ہے جس کے تحت مادر پدر آزاد بے حیا تہذیب کے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ان کی ترجیح اوّل ہے۔ جبکہ ہمارا حکمران طبقہ امریکی دباؤ پر ہر معاملے میں یوٹرن لینے کے لیے تیار ہے' خواہ اس معاملے کا تعلق ہماری خارجہ و داخلہ پالیسی کے ساتھ ہو' خواہ ہماری سماجی و اخلاقی اقدار کے ساتھ ہو اور خواہ دین و ایمان کے ساتھ ہو۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل میں موجود دانشور پاکستانی مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت کے معروف دینی مکاتب فکر یعنی اہل سنت والجماعت کی نمائندگی نہیں کرتے' جن میں دیوبندی' بریلوی' اہل حدیث اور جماعت اسلامی کی طرز کی تمام جماعتیں شامل ہیں۔ ان دانشوروں کا مقصد سنت کی آئینی حیثیت کو ختم کرنا ہے۔ یہ دانشور دراصل غلام احمد پرویز کے فکری سلسلہ سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھتے ہیں جو تمام اہل سنت والجماعت کے تمام مستند علماء کے نزدیک ایک گمراہ طبقہ ہے۔ اپنے عقائد و افکار کے حوالے سے اس طبقہ فکر کو اگر خوارج اور معتزلہ کا مرکب قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ ایک محدود اور مخصوص طبقہ ہے جو اثر و نفوذ کے لحاظ سے حکمران طبقے میں گہری جڑیں رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں اسی طبقے کے مرتب کردہ عائلی قوانین کو جن کے بارے میں ملک کے تمام معروف دینی مکاتب فکر کے چوٹی کے علماء نے متفقہ رائے دی تھی کہ یہ قطعی طور پر غیر اسلامی ہیں' ایک چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ایوب خان نے جبراً اس ملک پر مسلط کر دیا تھا جس کے منحوس اثرات آج تک اس قوم کو بھگتنے پڑے۔ اسی طرح آج ایک فوجی آمر اسی طبقۂ فکر کے مرتب کردہ تحفظ نسواں بل کو نافذ کرنے پر تلا ہوا ہے جس کے خلافِ اسلام ہونے پر ملک کے تمام مستند اور معروف دینی مکاتب فکر

\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\arr-september.inp 8/20/2014 4:14 PM PAGE 1 (1,1)

متفق ہیں۔

حکومت اگر واقعی اسلام کے ساتھ مخلص ہے تو اسے چاہیے تھا کہ وہ حقوقِ نسواں بل کا مسئلہ مستند علماء کے حوالے کرتی جن کی بات عوام میں تسلیم بھی کی جاتی ہے۔ حکومت کے کارپردازان کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کا اہتمام تمام مذاہب میں سب سے زیادہ دینِ اسلام ہی میں کیا گیا ہے۔ اسلام عورت کو اس کا وقار عطا کرتا ہے۔ محمد عربی ﷺ کا عطا کردہ نظام ہی حقوقِ نسواں کا حقیقی ضامن ہے۔ اس کے سوا جو نظام بھی ہوگا وہ خواہ بظاہر کتنا ہی خوشنما نظر آئے حقیقت میں بولہبی ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانی تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو/ویڈیو کیسٹس/سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

Visit us at www.tanzeem.org

تذکرہ و تبصرہ

قرآن اور سنت کا باہمی تعلق

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ
صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کا انجمن کے سالانہ اجلاس (منعقدہ ۱۹۸۴ء)
کے موقع پر صدارتی خطاب

نحمدہٗ ونصلی علٰی رسولہِ الکریم ...... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی تَاۡتِیَہُمُ الۡبَیِّنَۃُ ۙ﴿۱﴾ رَسُوۡلٌ مِّنَ اللّٰہِ یَتۡلُوۡا صُحُفًا مُّطَہَّرَۃً ۙ﴿۲﴾ فِیۡہَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ ؕ﴿۳﴾﴾ (البیّنۃ)

﴿وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الۡہُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِہٖ جَہَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾﴾ (النّساء)

اس نشست میں ’’قرآن اور سنتِ رسول ﷺ کا باہمی تعلق‘‘ کے موضوع پر بہت مفصل اور طویل خطاب پیشِ نظر نہیں ہے۔ آپ حضرات اس مسلّمہ حقیقت کو جانتے اور مانتے ہیں کہ قرآن اور سنتِ رسول ﷺ لازم وملزوم ہیں اور ان کا باہم چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اِس وقت میں سورۃ البیّنۃ کی ابتدائی چار آیات کی روشنی میں گفتگو کروں گا، جنہیں شاید ہی کبھی اس موضوع پر پیش کیا گیا ہو۔ لیکن میرے نزدیک یہی آیات اس موضوع کے ضمن میں اہم ترین ہیں۔ ارشاد ہوا:

﴿لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ اَہۡلِ الۡکِتٰبِ وَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ مُنۡفَکِّیۡنَ حَتّٰی

E:\Meesaaq_2006\Ma_2006\meesaq september\ma22-08 quran aor sunnat ka bahmi taluq.inp 8/20/2014 5:08 PM PAGE 1 (1,1)

تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ (البيّنة)

''اہل کتاب اور مشرکین میں سے جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی تھی وہ (اپنی اس گمراہی سے اور کفر سے) ہرگز باز آنے والے نہ تھے جب تک کہ ان کے پاس بیّنہ نہ آ جاتی''۔

یہاں ''بیّنہ'' کا لفظ بہت اہم ہے اور اسی سے اس سورۂ مبارکہ کا نام ماخوذ ہے۔ ''بیّن'' عربی زبان میں ایسی شے کو کہتے ہیں جو بالکل اظہر من الشمس ہو' اسے کسی خارجی واضافی دلیل کی حاجت نہ ہو۔ جیسے کہا جاتا ہے ''آفتاب آمد دلیلِ آفتاب''۔ کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد وہ خود ہی اپنے وجود پر بہت بڑی دلیل ہے' اور اگر کسی منطقی استدلال سے سورج کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی تو کچھ شکوک وشبہات تو پیدا کر دیے جائیں گے' لیکن یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا' اس لیے کہ سورج خود اپنے وجود پر دلیلِ قاطع ہے۔ چنانچہ وہ چیز جو بالکل روشن ہو' از خود واضح ہو اور اسے کسی خارجی سہارے اور استدلال کی ضرورت نہ ہو وہ ''بیّن'' ہے۔ جبکہ ''بیّنة'' اصل میں کیا ہے' اسے اگلی آیت میں define کیا گیا ہے:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝﴾

''ایک رسول جو اللہ کی طرف سے آیا ہے جو پڑھتا ہے ایسے پاکیزہ صحیفے کہ جن میں بالکل راست اور درست تحریریں (اللہ کی کتابیں) درج ہیں''۔

معلوم یہ ہوا کہ دونوں چیزیں مل کر ''بیّنہ'' بنتی ہیں' ان میں سے کسی ایک کو ''بیّنہ'' قرار نہیں دیا جا سکتا۔ رسول اور کتاب ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) ہیں اور یہ دونوں مل کر بیّنہ بنتی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ محمدٌ رسول اللہﷺ کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے۔ لیکن غور کیجیے کہ جب رسول اللہﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز کیا تو قرآن کہاں تھا؟ اُس وقت قرآن معجزے کے طور پر ابھی موجود نہیں تھا۔ چنانچہ بیّنہ ہونے کے اعتبار سے جو شے مقدم ہے وہ رسول کی ذات اور رسول کی شخصیت ہے(ﷺ)۔ یہی وجہ ہے کہ جب آنحضورﷺ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو سب سے پہلے اپنی سیرت و کردار کو دلیل کے طور پر پیش کیا۔ کوہِ صفا پر کھڑے ہو کر آپﷺ

نے جو پہلا خطاب کیا وہ یہ تھا کہ ''لوگو! تم نے مجھے کیسا پایا......؟'' گویا رسول اپنی ذات میں سب سے پہلے خود دلیل ہے۔ یعنی بیّنہ ہونے میں رسول کی ذات مقدم ہے کتاب پر۔ کتاب کو تو بطورِ معجزہ تحدّی کے ساتھ' دلیل اور چیلنج کے انداز میں پہلی مرتبہ مکی دَور کے اواخر میں پیش کیا گیا۔ تین مکی سورتوں سورۂ بنی اسرائیل' سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تم اس قرآن کا جواب نہیں لا سکتے۔ سب سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل میں پوری کتاب کا ذکر کیا گیا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾﴾

''(اے نبیؐ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جن جمع ہو جائیں (اور پوری قوتوں اور صلاحیتوں کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اس قرآن جیسی کتاب پیش کریں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لا سکیں گے' چاہے وہ ایک دوسرے کی مدد کرنے والے ہوں''۔

سورۂ ہود میں دس سورتوں کا ذکر ہے:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ ......﴾ (آیت ۱۳)

''کہہ دیجیے (اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ قرآن منزل مِن اللہ نہیں ہے) تو اس جیسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ......''

اس کے بعد سورۂ یونس میں بر سبیل تنزل ایک سورۃ کا چیلنج دیا گیا کہ:

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۸﴾﴾

''(اے نبیؐ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو''۔

پھر اسی چیلنج کو مدنی سورت' سورۃ البقرۃ میں بایں الفاظ دہرایا گیا:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾﴾

’’اور اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورت تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو اللہ کے سوا‘ اگر تم سچے ہو‘‘۔

چنانچہ یہ ہے اصل بات کہ قرآن مجید بطورِ معجزہ پیش ہوا ہے مکی دَور کے اواخر میں‘ جبکہ نصف سے زائد قرآن نازل ہو چکا تھا۔ اور یہ بات بالکل عقلی اور منطقی ہے۔ اس لیے کہ ابھی جب چند آیات ہی اُتری تھیں تو اُن کو اس طور سے چیلنج کے انداز میں پیش کیا جانا غیر منطقی بات ہوتی۔ تو گویا بیّنۃ ہونے کے اعتبار سے رسول ﷺ کی ذات مقدم ہے خود قرآن مجید پر۔

اسی کے ساتھ ذہن میں یہ بات بھی رکھئے کہ جہاں تک دین کے عملی پہلو کا تعلق ہے اس ضمن میں آپ کو بے شمار ایسی مثالیں مل جائیں گی کہ رسول اللہ ﷺ کے ذریعے کسی کام کا آغاز پہلے کرا دیا گیا اور اس کے بعد کہیں جا کر اس کے بارے میں آیات نازل ہوئیں۔ اس ضمن میں سب سے بڑی مثال وضو کی ہے۔ آپ غور کیجیے کہ وضو کا نظام مکہ کے اندر نافذ ہو چکا تھا۔ پنج گانہ نماز کا نظام ۱۱ نبوی میں آ چکا تھا‘ جبکہ مطلقاً نماز تو اس سے پہلے آ چکی تھی۔ تو کیا کوئی شخص یہ باور کر سکتا ہے کہ تب وضو کا معاملہ نہ ہو گا؟ لیکن قرآن مجید کے الفاظ میں وضو کا جو حکم نازل ہوا وہ سورۃ المائدۃ میں ہے‘ جو ۷ ہجری میں نازل ہوئی۔ تو کیا یہ پورا عرصہ یعنی سات برس مسلمانوں نے وضو کے بغیر نمازیں پڑھیں؟ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا جو عملی پہلو ہے اس کے اعتبار سے بھی رسولؐ مقدم ہے قرآن پر۔ یعنی رسول ﷺ کے ذریعے بہت سے معاملات میں بات پہلے پہنچائی گئی اور قرآن مجید کی آیات گویا اس کی توثیق میں نازل ہوئیں۔

وحی کے مختلف ذرائع

اس حقیقت کو ایک اور بات سے بھی سمجھ لیجیے۔ اس لیے کہ اس دَور میں بعض چیزیں جدید عقلیت پسندی (rationalism) کے زیر اثر ذہنوں سے اوجھل ہو گئی

ہیں۔ آج شاید یہ سمجھا جاتا ہے کہ وحی کی بس ایک ہی شکل ہے جسے وحیٔ نبوت کہتے ہیں' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مختلف ذرائع (channels) بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً حیوانات میں جو جبلی ہدایت (animal insitinct) ہے اسے بھی وحی قرار دیا گیا ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ......﴾(النحل:٦٨) ''اور تیرے ربّ نے وحی کی شہد کی مکھی کی طرف''۔ تو حیوانات کی جبلی ہدایت کے لیے وحی کا لفظ استعمال ہو رہا ہے۔ پھر بہت سے غیر نبی افراد کے لیے بھی یہ الفاظ آئے ہیں کہ اُن پر وحی کی گئی۔ حضرت مریم (سلامٌ علیہا) کے بارے میں ہمارا اجماع ہے کہ وہ نبی نہیں تھیں' لیکن ان پر وحی ہوئی۔ ان کے بارے میں تو پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بہت اونچا مقام ہے' خود قرآن کی رو سے ''صِدِّیۡقَة'' ہیں' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لیے بھی وحی کا لفظ آیا ہے: ﴿وَاَوۡحَیۡنَا اِلٰی اُمِّ مُوۡسٰی......﴾ (القصص:٧) ''اور ہم نے وحی کی موسیٰ کی ماں کی طرف......''۔ معلوم یہ ہوا کہ وحیٔ نبوت کا معاملہ تو بڑی چوٹی کی چیز ہے۔ اس سے کمتر درجے کی بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن پر لفظاً (literally) وحی کا اطلاق ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ وحیٔ نبوت کے سوا تمام channels آج بھی کھلے ہیں' جیسے الہام ہوسکتا ہے' کشف ہے جو اولیاء اللہ کو ہوتا ہے' القاء ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں کوئی بات ڈال دیتا ہے' اسی طرح سے رؤیاء صالحہ (سچے خواب) ہیں' جن کے بارے میں نبی ﷺ نے فرمایا:

((لَمۡ یَبۡقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلاَّ الۡمُبَشِّرَاتُ)) قَالُوۡا : وَمَا الۡمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ : ((الرُّؤۡیَا الصَّالِحَةُ))(١)

''بشارتوں کے سوا نبوت کی کوئی چیز باقی نہیں رہی''۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ بشارتوں سے کیا مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سچا خواب''۔

صحیح مسلم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

((اِنَّہٗ لَمۡ یَبۡقَ مِنۡ مُبَشِّرَاتِ النُّبُوَّةِ اِلاَّ الرُّؤۡیَا الصَّالِحَةُ یَرَاھَا الۡمُسۡلِمُ اَوۡ

(١) صحیح البخاری' کتاب التعبیر' باب المبشرات۔

یُرٰی لَـہٗ))(۲)

’’یقیناً مبشراتِ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں بچا سوائے سچے خواب کے جو مسلمان دیکھتا ہے یا اُس کے لیے دیکھا جاتا ہے‘‘۔

رسول اللہﷺ نے مزید فرمایا:

((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ جُزْءٌ مِنْ سِتَّۃٍ وَاَرْبَعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّـبُـوَّۃِ))(۳)

’’سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔‘‘

اور کہیں آپؐ نے اس (سچے خواب) کو نبوت کا ساٹھواں حصہ بتایا ہے۔ جیسے مسلم کی ایک روایت میں الفاظ آئے ہیں:

((اَلرُّؤْیَا الصَّالِحَۃُ جُزْءٌ مِنْ سَبْعِیْنَ جُزْءً مِنَ النُّبُوَّۃِ))(۴)

’’سچے خواب نبوت کے ساٹھ حصوں میں سے ایک ہیں۔‘‘

تو معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں اب بھی جاری ہیں اور نبیﷺ کے ساتھ بھی یہ تمام کی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کا خواب بھی وحی ہے‘ نبی کا القاء بھی وحی ہے‘ نبی کا الہام بھی وحی ہے‘ نبی کو جو کچھ اللہ تعالیٰ دکھا دیتا ہے وہ بھی وحی ہے‘ اور نبی کو اللہ تعالیٰ جو بصیرت عطا فرماتا ہے وہ بھی وحی ہے۔ اس لیے کہ نبی جو آسمانی ہدایت وصول (receive) کرتا ہے اس کا کوئی ایک چینل نہیں ہے‘ بلکہ اس کے متعدد channels ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے حالات و واقعات کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ ایک خواب تھا جو انہوں نے بیٹے کو ذبح کرنے کے ضمن میں دیکھا تھا۔ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

﴿یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۰۲)

’’اے بیٹے! میں دیکھتا ہوں خواب میں کہ تجھ کو ذبح کرتا ہوں۔‘‘

---

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الصلاۃ‘ باب النھی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود۔

(۳) صحیح البخاری‘ کتاب التعبیر‘ باب الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزءً من النبوۃ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الرؤیا‘ باب ۔

(۴) صحیح مسلم‘ کتاب الرؤیا‘ باب۔

اب سمجھئے کہ کتنا سنگین معاملہ ہے کہ قتل ناحق بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ (اکبر الکبائر) ہے۔ اگر نبی کو اپنے خواب کے بارے میں ذرا سا بھی اشتباہ ہوتا تو کیا اتنی بڑی جرأت کی جا سکتی تھی جب تک کہ وحی باللّفظ (verbal revelation) کی صورت میں واضح ہدایات نہ آ جاتیں؟ اگر ذرا سا بھی اس میں کسی اشتباہ کا معاملہ ہوتا تو اس حکم پر عمل کرنا بہت غلط بات ہو جاتی۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو جو خواب دکھایا گیا کہ عمرہ کر رہے ہیں تو آپؐ عمرہ کرنے کے لیے چل پڑے۔ آپؐ نے اس سلسلے میں سفر کیا اور پھر صلح حدیبیہ ہوئی۔ یہ ساری چیزیں بھی ایک خواب کی بنیاد پر ہیں۔ تو یہ تمام ذرائع (channels) ہیں جن سے نبی کو راہنمائی ملتی ہے۔ ان میں سے خاص وہ جو وحی باللفظ (verbal revelation) ہے وہ قرآن میں محفوظ (recorded) ہے۔ باقی مختلف طریقوں سے جو رہنمائی اور علم آپؐ کو ملتا رہا ان سب کے بارے میں ایک نہایت جامع حدیث ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَلَا اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ مَعَہٗ))(۵) ''جان لو' مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس جیسی ہی ایک چیز اور بھی''۔ جو اس کے ہم وزن اور اس کے برابر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو جو خاص بصیرت عطا فرمائی' آپؐ کو جو مشاہدات کرائے' آپؐ پر جو کچھ القاء فرمایا' جو الہام فرمایا' آپؐ کو خواب کے ذریعے جو ہدایات ملتی رہیں اور آپؐ کو جو بھی کشف ہوتا رہا' یہ تمام چیزیں نبی ﷺ کے لیے بھی قطعی ہیں جن میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں اور یہ بھی درحقیقت وحی کا حصہ ہیں۔ البتہ یہ وحی متلو نہیں ہے' یہ وحی باللّفظ (verbal revelation) نہیں ہے۔

ہمارے ہاں وحی کے لیے دو اصطلاحیں مستعمل ہیں' وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو۔ وحیٔ متلو وہ ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور وہ ہے قرآن۔ اور وحیٔ غیر متلو وہ ہے جس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں انہیں وحیٔ جلی اور وحیٔ خفی کہتے ہیں۔ وحیٔ جلی جو بالکل واضح ہے اور وہ قرآن ہے' اور دوسری وحیٔ خفی ہے' اس کو ہم قرآن کے

(۵) سنن ابی داوٗد' کتاب السنۃ' باب فی لزوم السنۃ۔

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms22-08 quran aor sunnat ka bahmi taluq.inp 8/20/2014 5:09 PM PAGE 4 (1,1)

درجے میں نہیں رکھتے‘ لیکن وحی ہونے کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں‘ جیسا کہ شرکِ جلی اور شرکِ خفی کے بارے میں مَیں عرض کیا کرتا ہوں کہ شرک ہونے کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک واضح ہے‘ سامنے دکھائی دینے والا شرک ہے کہ ایک شخص بُت کو سجدہ کر رہا ہے اور ایک ذرا اندر چھپا ہوا‘ ریاکاری والا شرک ہے کہ ایک انسان کسی کو خوش کرنے کے لیے نیک کام کر رہا ہے۔ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ ، وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ ، وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ)) (مسند احمد) ’’جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی وہ شرک کر چکا‘ جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا وہ شرک کر چکا‘ اور جس نے دکھاوے کے لیے صدقہ کیا وہ شرک کر چکا۔‘‘ تو شرکِ خفی اور شرکِ جلی میں شرک ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں‘ دونوں شرک ہیں۔ البتہ ایک ظاہر و باہر شرک ہے اور ایک چھپا ہوا شرک ہے۔ اسی طرح وحیٔ خفی اور وحیٔ جلی کا معاملہ ہے۔

فتنہ انکارِ سنّت کی بنیادیں

ہمارے ہاں انکارِ سنت کا فتنہ بڑا قدیم ہے اور ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں جب بھی کوئی فتنہ اٹھتا ہے اس کی زد رسالت اور سنت پر پڑتی ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مسیلمہ کذاب کا نعرہ یہ تھا: کَفَانَا هِدَایَةُ الْقُرْآنِ ’’ہمیں صرف قرآن کی ہدایت ہی کافی ہے‘‘۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفریق ہے‘ جس کا ذکر سورۃ النساء میں بایں الفاظ کیا گیا ہے: ﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ (آیت ۱۵۰) یعنی کچھ لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے ہیں۔

سورۃ النساء کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین پر جو چیزیں شاق گزرتی تھیں وہ تین تھیں: (۱) رسول اللہﷺ کی اطاعت‘ جو شخصی اطاعت بن جاتی ہے۔ قرآن تو ایک ادارہ (institution) ہے‘ جس میں اپنے جیسے گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان کے سامنے سر جھکانا نہیں پڑتا۔ جبکہ محمدﷺ کا اللہ کا رسول ہونا ایک

مخفی بات ہے‘ جو عالمِ غیب سے متعلق ایک شے ہے‘ لیکن آپؐ نظر تو سب کو یہی آتے تھے کہ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔ چنانچہ اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا کہ جو آپؐ حکم دیں گے وہ مانوں گا‘ یہی ان کے لیے سب سے زیادہ شاق گزرنے والی بات تھی۔ (۲) قتال فی سبیل اللہ‘ اور (۳) ہجرت— یہ تین چیزیں تھیں جن کا سورۃ النساء میں تفصیل سے ذکر ہوا ہے اور منافقین کے لیے سب سے کٹھن یہی مراحل تھے۔ معلوم ہوا کہ بعد میں جب بھی فتنہ اٹھا اسی بنیاد پر اٹھا۔ خوارج کا بھی یہی نعرہ تھا: حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ ’’ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔‘‘ یعنی ہمیں صرف کتاب اللہ چاہیے اس کے سوا کچھ نہیں چاہیے‘ ہم تو صرف اسی کی پیروی کریں گے۔ اور یہ ہماری اُمت کی تاریخ میں عظیم ترین فتنہ تھا۔ پھر اس کے بعد بھی ہماری تاریخ میں اسی بنیاد پر فتنے اٹھتے رہے ہیں۔

برعظیم پاک و ہند میں انکارِ سنّت کا جو فتنہ اٹھا دراصل اس کی جڑ میں مشرق اور مغرب کی دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ ایک ہماری اپنی پرانی تہذیب ہے‘ اس کی اپنی روایات ہیں‘ اس کے کچھ شعائر ہیں‘ اس کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو متفق علیہ ہیں۔ لیکن جب انگریز ہمارے ہاں آیا اور اس نے ہمیں فتح کیا اور ہم پر حکمران ہوا تو وہ ایک نئی تہذیب لے کر آیا۔ چنانچہ دو تہذیبوں کا تصادم شروع ہوا اور ہمارے ہاں ابتدا ہی میں دو رائیں بن گئیں۔ ایک رائے کے سب سے بڑے قائل اور اس کو پیش کرنے والے سرسید احمد خان تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مسلمانوں سے خلوص و اخلاص کی بنا پر ان کی بہتری کے لیے یہ رائے سامنے رکھی کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم انگریزی پڑھیں‘ انگریزی علوم سیکھیں‘ انگریزی تہذیب اختیار کریں اور انگریزوں کے قریب ہو جائیں‘ بلکہ ان کے الفاظ یہاں تک نقل کیے گئے ہیں کہ ہمیں صرف چمڑی کی رنگت کے سوا (کیونکہ اس پر تو ہمارا قابو اور اختیار نہیں) ہر چیز میں انگریز ہو جانا چاہیے۔ اور اس کی وجہ کیا تھی؟ یہ کہ ان کے سامنے قومی مسابقت تھی کہ ہندو تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اگر ہندو نے آگے بڑھ کر انگریز کے ساتھ اپنا معاملہ کر لیا تو مسلمان یہاں برعظیم

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms22-08 quran aor sunnat ka bahmi taluq.inp 8/20/2014 5:09 PM PAGE 5 (1,1)

میں اچھوت بن کر رہ جائیں گے اور ان کا کوئی دنیاوی و سیاسی مستقبل نہ رہے گا۔ وہ چونکہ بنیادی طور پر قومی رہنما تھے اس لیے انہوں نے یہ تجزیہ پیش کیا۔ دوسری طرف علمائے کرام تھے جن کا اپنا ایک طرزِ عمل تھا اور وہ اس پر اَڑ گئے کہ ہم **قَالَ اللّٰہُ** اور **قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ** ﷺ کے دامن سے وابستہ رہیں گے۔ ہم اپنے آپ کو اپنی روایات‘ اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کے ساتھ باندھے رکھیں گے‘ دنیا بگڑتی ہے تو بگڑے‘ ہم کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ مسلمان اس نئی تہذیب میں بہہ نہ جائیں۔ یہاں سے وہ تصادم شروع ہوا۔

اب ظاہر بات ہے ایک غالب تہذیب تھی جو حکمرانوں کی تھی۔ حکمرانوں سے مرعوبیت ویسے ہی ہوتی ہے‘ لہٰذا لوگ اس نئی تہذیب کی طرف لپکے۔ پھر کچھ لوگوں نے دیکھا کہ اس سارے معاملے میں جو رکاوٹ بنتی ہے وہ ہے سنتِ رسولؐ اور حدیثِ رسولؐ۔ ان کا خیال تھا کہ قرآن مجید کی تو ہم کچھ نہ کچھ تاویل کر لیں گے‘ اس کے کچھ نہ کچھ معنی نئے سے نئے نکال لیں گے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ کہا گیا کہ: ﴿**اِضْرِبْ بِّعَصَاکَ الْبَحْرَ**﴾(الشُّعراء:٦٣) ’’مارو اپنا عصا سمندر پر‘‘۔ اب ’’ضَرَبَ‘‘ کے مختلف معنی ہیں۔ ’’ضَرَبَ‘‘ کا معنی زمین میں چلنا پھرنا بھی ہوتا ہے اور مارنا بھی۔ اب اس معجزہ کے بارے میں جدید سائنسی عقلیت پسندی کے دور میں ہم لوگوں سے یہ کیسے کہیں کہ ہم یہ مانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ کا عصا سمندر پر پڑا اور سمندر پھٹ گیا؟ لہٰذا اس کی کوئی تاویل کی جائے‘ کوئی ایسا ترجمہ کیا جائے جو سائنس کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اسی طرح جنات کے بارے میں ہم یہ کیسے کہہ دیں کہ ان کا بھی کوئی وجود ہے‘ وہ غیر مرئی (invisible) ہیں اور آگ سے بنے ہیں؟ ان کے نزدیک یہ بڑی مشکل بات تھی کہ وہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سامنے یہ باتیں کہیں۔ لہٰذا ان کی ایسی تاویلات کی گئیں جو جدید مغرب زدہ اذہان کے لیے قابل قبول ہوں۔ حدیث کا معاملہ یہ تھا کہ اس سے ہماری تہذیبی روایات بنی تھیں اور اسی نے ہمیں زندگی کا نقشہ دیا تھا‘ لیکن اُس وقت یہ کہہ دیا گیا کہ اس کی زیادہ ضرورت نہیں‘ ہمیں تو صرف قرآن

ہی کافی ہے۔

یہ فکر ہمارے ہاں رفتہ رفتہ پھیلتا چلا گیا۔لیکن اُس وقت دو چیزیں ایسی تھیں جن کی بنا پر یہ فکر زیادہ نہیں پھیلا' صرف ہمارے ہاں ایک اونچا طبقہ تھا جس تک یہ محدود رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ابھی ہمارا مغربی تہذیب وتمدن سے براہِ راست رابطہ بہت کم تھا۔لوگوں کی مغرب میں آمد و رفت بہت کم تھی۔ دوسرے یہ کہ وہاں سے جو آئے ہوئے تھے وہ ہمارے حکمران تھے' جو غاصب تھے اور ہم ان کے محکوم تھے' لہٰذا فطری طور پر عوام کے دلوں میں ان کے خلاف نفرت موجود تھی۔ یہی وجہ تھی کہ کم ہی لوگ تھے جنہوں نے اس تہذیب کو اپنایا اور عوام کی اکثریت اپنی تہذیب اور روایات پر قائم رہی۔

تہذیبوں کا یہ تصادم سب سے پہلے شدید ترین صورت میں ترکی میں سامنے آیا۔ اس لیے کہ ترکی دراصل مشرق اور مغرب کے مابین پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ خالدہ ادیب خانم کے زمانے سے جو مضامین لکھے گئے اور اتاترک نے جس طرح کا معاملہ وہاں کیا' یہ تہذیبِ مغرب کی بالادستی تھی۔ پھر بحیرۂ روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع عرب ممالک شام' فلسطین' مصر اور مراکو اس کی زد میں آئے۔اس کو یوں سمجھئے کہ بحیرۂ روم ایک جھیل کی مانند ہے۔اس کے ایک طرف یورپ اور دوسری طرف یہ سارے مسلم ممالک ہیں۔ ان کی مغرب میں آمد و رفت چونکہ بہت تھی لہٰذا مغربی تہذیب کا اثر ان پر سب سے پہلے اور بہت زیادہ ہوا۔ ہمارے ہاں تو سات سمندر کا فاصلہ شمار ہوتا تھا' شاذ ہی لوگ وہاں جاتے تھے۔ زیادہ تر تو پڑھنے ہی جاتے تھے' اور جو وہاں سے واپس آتا تو اس کے بارے میں مشہور ہو جاتا کہ ''کرسٹان'' ہو گیا ہے۔ باقی یہ کہ عام لوگوں کا اتنا زیادہ رابطہ نہیں تھا' اور جیسا کہ عرض کیا گیا' چونکہ یہ باہر کے لوگ تھے جو آ کر ہم پر حکمرانی کر رہے تھے' اس لیے ان کے ساتھ نفرت کا معاملہ بھی تھا۔

متذکرہ بالا دونوں عوامل (factors) تقسیم ہند کے قریب آ کر اور آزادی کے بعد ختم ہو گئے' لہٰذا بند کھل گیا۔ اب ایک طرف تو لوگوں کی مغرب میں آمد و رفت بے پناہ ہے۔ ہماری نوجوان نسل کا ایک بڑا حصہ جو وہاں جاتا ہے وہاں سے متأثر ہو کر

آ تا ہے' ان کے رنگ میں رنگ کر آ تا ہے' اور دوسرے یہ کہ انگریز کے جانے کے بعد اس کی جگہ اب وہ دیسی انگریز حکمران ہیں جو سرسید کے قول کے مطابق صرف چمڑی کے دیسی ہیں' باقی اپنی تہذیب' اپنی تربیت' اپنی شخصیت اور ذہنیت کے اعتبار سے بالکل یورپین ہیں۔ اب وہی ہمارے ملٹری کے اعلیٰ عہدیداران ہیں' وہی ہماری سول بیورو کریسی کے سب سے اونچے ستون ہیں' لہٰذا یہاں مغربی تہذیب کی بالادستی کا معاملہ بہت تیزی کے ساتھ ہوا ہے اور ہمارے ہاں اِس وقت جو مسئلے کھڑے ہو گئے ہیں ان کی بنیاد میں وہی تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے۔ دیت کا مسئلہ ہو' شہادت کا مسئلہ ہو یا ستر وحجاب کا مسئلہ ہو' ان کی بنیاد میں وہی نظریۂ مساواتِ مَرد وزن ہے جو یورپ سے آیا ہے۔ یہ وہی دو تہذیبوں کا ٹکراؤ ہے جو آپ کو اب نظر آ رہا ہے۔ میں نے تو ایک خط بھی پڑھا تھا جو ''پاکستان ٹائمز'' میں شائع ہوا تھا اور اس میں مکتوب نگار نے یہاں تک لکھ دیا کہ قرآن کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ قرآن واقعتاً عورتوں کو ثانوی پوزیشن الاٹ کرتا ہے' لہٰذا ہمیں اجتہاد کا کوئی ایسا اصول اپنانا ہو گا جو قرآن سے بھی اوپر چلا جائے۔ آج اسلامی جمہوریہ پاکستان میں یہ بھی کہنے والے موجود ہیں۔ پھر ہمارے ایک بڑے عالمِ دین کا یہ بیان بھی اخبارات میں آ گیا کہ نصوص کے اندر بھی اجتہاد ہو سکتا ہے' حالانکہ وہ اہل حدیث مکتبِ فکر کے آدمی ہیں۔ یہ ساری چیزیں آپ گنتے جائیے۔ درحقیقت یہ وہی ''دو تہذیبی ٹکراؤ اور تصادم'' ہے۔ اس میں جو چیز بھی جہاں پر بھی رکاوٹ بنتی نظر آتی ہے' کہیں اس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ فلاں چیز قرآن میں نہیں ہے' اور سنت کی اہمیت ثانوی نظر آئے گی۔ کہیں اس سے بھی آگے چل کر یہ کہا جائے گا کہ کوئی حدیث معیار پر پوری نہیں اتر رہی۔

اسلامی قوانین کے مآخذ

اس ضمن میں اصولی بات یہ ہے کہ جہاں ہمارے قانون کا اوّلین منبع اور ماخذ (source) قرآن مجید ہے وہاں اس کا دوسرا ماخذ سنتِ رسول ہے جو اپنے طور پر خود مختار (independent) ہے۔ جبکہ تیسرے نمبر پر خود رسول اللہ ﷺ کے قول

کے مطابق‘ سنت خلفاء راشدین مہدیّین ہے۔

ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہماری جو تاریخ ہے یہ کُل کی کُل تاریک نہیں ہے۔ ہماری تاریخ بہت روشن رہی ہے‘ پچھلی تین چار صدیاں اگر تاریکی میں گزری ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم شرم اور خجالت سے اپنے سر جھکا لیں کہ شاید ہماری پوری تاریخ بالکل تاریک ہے۔ ہماری تاریخ بہت روشن ہے۔قرآن نے اور سنتِ رسولؐ نے جو روشنی دی تھی خلافتِ راشدہ کا ایک عظیم نظام اُس پر چلا۔ اس کے بعد دورِ اُموی اور دورِ بنوعباس میں یہ تو ضرور ہوا کہ حکومت کی اعلیٰ ترین سطح پر جو دستوری نظام تھا وہ بدل گیا‘ لیکن تہذیبی روایات کا ارتقاء اور ان کا تسلسل جاری رہا۔ان اَدوار میں ہمارے جو ائمۂ دین اور محدثین گزرے ہیں ان میں سے ایک ایک چاند ستاروں کی مانند ہے۔ ہماری تاریخ کے ان افراد کی خدمات‘ ان کا علمی مقام و مرتبہ اور اس پر مستزاد اِن کا تدیّن‘ تقویٰ‘ احتیاط اور للّٰہیت کا جو معیار ہمیں ملتا ہے‘ ہماری تاریخ ان چیزوں سے بنی ہے۔

سنت خلفاءِ راشدین کے بعد اہل سنت کے چاروں ائمہ کا اگر کسی بات پر اجماع ہو گیا‘ وہ کسی چیز پر متفق ہو گئے تو یہ خود اپنی جگہ پر ایک دلیل ہے۔اور درحقیقت دلیل یہ نہیں ہے کہ یہ ائمۂ اربعہ کا موقف ہے‘ بلکہ یہ درحقیقت اُس تعامل کا مظہر ہے جو پیچھے سے چلا آ رہا تھا۔ دورِ نبوت میں جو کچھ روایات بنی تھیں یہ درحقیقت اسی کا مظہر ہے۔کیا ہم امام ابوحنیفہ‘ امام شافعی‘ امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں یہ گمان کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے پاس سے کوئی چیز گھڑ کر لائے ہوں گے؟ کیا ہم ان کے بارے میں ایسا سوچ سکتے ہیں؟ تو معلوم یہ ہوا کہ اگر ائمۂ اربعہ کا کسی بات پر اجماع ہے تو وہ بے دلیل نہیں ہے‘ خواہ اس کے بارے میں کوئی نص پیش نہ کی جا سکے۔

دیکھئے ایک بات بڑی سادہ سی ہے‘ بسا اوقات ایک سچی حقیقت عدالت میں جا کر ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے یہ معنی تو نہیں کہ وہ سچی حقیقت جھوٹی ہو گئی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ لوگو! کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قطعہ زمین کے متعلق تم میں سے دو افراد کا جھگڑا ہوتا ہے اور وہ میرے پاس آتے ہیں‘ ان میں سے ایک زیادہ

چرب زبان ہے اور وہ اپنی بات کو ثابت کر دیتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں' لیکن جان لو کہ اگر کوئی مجھ سے غلط فیصلہ لے گیا تو وہ آگ کا ٹکڑا لے کر گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی شے کا صحیح ہونا اور ہے اور ثابت ہو جانا اور ہے' ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ نے اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا تھا تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو جھوٹا کہا گیا؟ قاضی کا موقف یہ تھا کہ جناب آپ کا دعویٰ بالکل سچا ہو گا مگر میری مجبوری یہ ہے کہ مجھے دو گواہ چاہئیں اور گواہی میں بیٹا اور غلام پیش نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اگرچہ حضرت علیؓ کے گواہ آپ کے بیٹے حضرت حسنؓ اور آپؓ کے غلام تھے' لیکن ان کی گواہی قبول نہ کی گئی اور زرہ یہودی کو دے دی گئی کہ اس پر آپؓ کا دعویٰ ثابت نہیں ہوا' جس پر وہ یہودی ایمان لے آیا اور اس نے زرہ بھی واپس کی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ صحیح تھا۔ بہرحال یہ ضروری نہیں کہ ہر صحیح بات ثابت بھی ہو جائے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی حدیث امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ کے جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہ اترے' لیکن اس کا معنی یہ نہیں کہ وہ حدیث غلط ہے اور موضوع ہے۔ ایسے بہت سے موتی ہو سکتے ہیں جو ہمارے پاس اُن احادیث میں موجود ہوں جو ان بڑے بڑے ائمہ کے جرح و تعدیل کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور انہوں نے انہیں قبول نہیں کیا۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اگر ہمارے معاشرے میں دورِ خلافتِ راشدہ میں کسی بات پر عمل ہوا تو یقیناً وہ بات صرف ایک حدیث کے بل پر نہیں تھی' دوسرے بہت سے عوامل ہوں گے جن کی وجہ سے دورِ خلافت راشدہ میں اس پر عمل ہوا۔ چنانچہ اگر ائمۂ اربعہ اس کے بعد کسی بات پر متفق ہو رہے ہیں تو یقیناً وہ کسی دلیل پر متفق ہوئے ہوں گے' خواہ کوئی حدیثِ صحیح اس سلسلے میں پیش نہ کی جا سکے۔ اس لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ائمۂ اربعہ کا اجماع از خود ایک دلیل بن جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں۔

ہمارے ہاں دیت اور قانونِ شہادت وغیرہ پر جو بحثیں چھڑ گئی ہیں' اس ضمن میں میرا اپنا ذاتی تجزیہ یہ ہے کہ اصل میں دو چیزیں بالکل جدا ہیں' انہیں آپس میں گڈمڈ نہیں

کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ کسی انسان میں انفرادی طور پر یا کسی قوم میں اجتماعی سطح پر ایک ارادہ پیدا ہو جانا کہ ہمیں مسلمان جینا ہے اور مسلمان مرنا ہے۔ دوسرے یہ کہ پھر اس کو یہ بتانا کہ اسلام کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ان دونوں کو گڈ مڈ نہ کیجیے۔ جب تک وہ ارادہ (will) ہی نہیں ہے تو ان بحثوں میں پڑنے کا فائدہ؟ ایک آدمی کے اندر ابھی وہ ارادہ ہی پیدا نہیں ہوا کہ وہ اللہ کے حکموں پر چلے اور آپ اسے اللہ کا حکم بتا رہے ہیں۔ ابھی اس کے دل میں وہ جذبہ ہی نہیں اُبھرا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سنت کا اتباع کرے اور آپ اسے سنتِ رسول ؐ پر لیکچر دے رہے ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ پہلے اجتماعی قومی سطح پر وہ ارادہ پیدا کریں۔ جب تک ارادہ پیدا نہیں ہوتا یہ بحثیں چھیڑ دینا بالکل بے کار ہے۔ اس سے لوگوں میں کنفیوژن بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چنانچہ انقلابی طریقہ کار کے ذریعے سے پہلے ارادہ پیدا کرنا ہوگا' اور وہ ارادہ پیدا ہوگا قرآن کی حکمت اور فلسفے سے' قرآن کی ہدایت اور روشنی کو عام کرنے سے۔ پھر اس ارادے کا انقلابی انداز میں ظہور ہوگا اور وہ اپنے آپ کو ثابت کرے گا کہ اس ملک میں رہنے والوں کے اندر اب یہ عزم پیدا ہو چکا ہے کہ وہ مسلمان جینا چاہتے ہیں اور مسلمان مرنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ سارے معاملات کھلتے چلے جائیں گے۔

اصلاحی صاحب کے موقف سے اعلانِ براءت

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ میرا ایک تعلق بہت طویل عرصے تک رہا ہے کہ میں ہی ان کا spokesman اور ان کا پبلشر رہا ہوں۔ میں نے ان کا پرچہ (میثاق) بھی شائع کیا اور تفسیر تدبر قرآن بھی' پھر لاہور میں اجتماعات بھی منعقد کروائے' لیکن اس کے بعد اب ان کی طرف سے حدِّ رجم کے بارے میں جو موقف سامنے آیا ہے تو اس سے اسی زور و شور سے اعلانِ براءت بھی کرنا ضروری ہے۔ ان کے فکر میں پہلے بھی بعض چیزیں ایسی آتی رہی تھیں کہ جن پر ہم چونکتے رہے۔ مثلاً سورۂ بنی اسرائیل کی تفسیر کرتے ہوئے معراج کو انہوں نے کچھ دبے لفظوں میں خواب کی شکل میں پیش کیا کہ یہ ایک ''رؤیا'' تھا۔ اس کے بارے میں ہم نے کہا کہ یہ موقف

درست نہیں ہے‘ لیکن اس کا معاملہ ہمارے عقائد کے ساتھ ہے‘ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر یہ کہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ اقوال ہمیں اسلاف میں بھی مل جاتے ہیں‘ جس طرح کہ رؤیتِ باری تعالیٰ میں اختلاف ہے کہ معراج میں رسول اللہﷺ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا یا نہیں؟ اب یہ اختلاف صحابہ کرام ؓ سے چلا آ رہا ہے۔ ایک طرف حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ نہیں دیکھا‘ دوسری طرف حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ دیکھا ہے۔ تو اس میں گنجائش پیدا ہو جاتی ہے کہ کوئی شخص کوئی بات کہے‘ لیکن جہاں تک دین کے عملی پہلو کا تعلق ہے اس کا معاملہ بہت ہی نازک اور پیچیدہ ہے۔ اس میں اہل ایمان کے راستے سے ہٹ کر کوئی دوسرا راستہ نکالا جائے گا تو وہ قابلِ قبول نہ ہوگا۔ اس کے بارے میں مَیں نے آغاز میں آیت پیش کی ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَـهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۝١١٥﴾ (النّساء)

’’اور جو کوئی مخالفت کرے رسولؐ کی اس کے بعد کہ اُس پر کھل چکی سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستے کے خلاف تو ہم حوالہ کریں گے اُس کو اسی طرف جو اُس نے اختیار کی اور ڈالیں گے اس کو دوزخ میں‘ اور وہ بہت ہی برا ٹھکانہ ہے‘‘۔

اہلِ ایمان کا راستہ جو بنا ہے وہ راستہ قرآن‘ سنتِ رسولﷺ‘ سنتِ خلفائے راشدین مہدیّین اور اس کے بعد ائمہ ٔ اربعہ کے اجماع سے بنا ہے۔ اہل سنت کا راستہ متذکرہ بالا مراحل سے ہو کر گزرا ہے اور وہ ایک شاہراہ ہے۔ اس کے لیے تو یوں کہا جائے گا: ’’لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا‘‘ یعنی اس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ اب اس راستے سے ہٹ کر جو بات کہی جائے گی اس سے اعلانِ براءت پوری شدت کے ساتھ کرنا ہوگا۔

رجم کے معاملے میں مولانا اصلاحی نے جو رائے ظاہر کی اس سے پہلے کا بھی ایک واقعہ بیان کیے دیتا ہوں۔ مولانا کی تفسیر کی دوسری جلد ابھی صرف میثاق میں چھپی تھی‘ کتابی شکل میں نہیں آئی تھی کہ سورۃ النساء کی ایک آیت کی تأویل جو مولانا نے کی‘ اس پر بعض علماء کا اعتراض آیا۔ ان میں ایک ساہیوال کے مولانا برکات احمد خاں صاحب

تھے‘ جو کوئی معروف عالمِ دین نہیں تھے۔ میں نے مولانا سے عرض کیا کہ ابھی یہ کتابی شکل میں نہیں چھپی‘ اس پر آپ نظرِ ثانی کر لیجیے۔ مولانا نے فرمایا کہ اب میں ہر شخص کی بات پر تو غور نہیں کر سکتا‘ کوئی بڑا عالمِ دین اگر بات کرے گا تو جواب دوں گا۔ یہ معاملہ اصل میں سورۃ النساء کی آیت ۳ سے متعلق تھا: ﴿وَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تُقۡسِطُوۡا فِی الۡيَتٰمٰى فَانۡكِحُوۡا مَا طَابَ لَكُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ مَثۡنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ ’’اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم لڑکیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو پھر نکاح کر لو دوسری عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں‘ دو دو تین تین اور چار چار سے‘‘۔ اس آیت کے بارے میں اجماعی نقطۂ نظر یہی ہے کہ اس سے مراد ہے کہ تم یتیم بچیوں سے نکاح کر کے اگر یہ سمجھتے ہو کہ ان کی طرف سے بولنے والا کوئی نہیں‘ ان کا کوئی بھائی یا باپ اُن کے حقوق کی نگہداشت کرنے والا موجود نہیں کہ ان کے حقوق اگر تلف کیے جا رہے ہوں تو کوئی ان کی طرف سے کھڑا ہو‘ تو پھر یتیم بچیوں سے نکاح نہ کرو‘ بلکہ جو دوسری عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے دو دو‘ تین تین‘ چار چار تک شادیاں کر لو۔ لیکن مولانا نے رائے ظاہر کی کہ یہاں ’’اُمّھات الیتٰمٰی‘‘ مراد ہیں‘ یعنی یتیموں کی ماؤں سے شادیاں کر لو۔ اب یہ بات اجماع کے خلاف تھی۔ اُن دنوں مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ کافی روابط تھے اور ’’مجلس دعوت و اصلاح‘‘ میں یہ حضرات شریک تھے۔ میں نے جب مفتی صاحبؒ سے یہ معاملہ عرض کیا تو انہوں نے کہا یہ تو واقعتاً بڑی گمراہی ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی یہ بات کتابی شکل میں نہیں چھپی‘ اور اگر آپ مولانا کو قائل کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے گا اور ابھی سے غلطی کی اصلاح ہو جائے گی۔ میرے بہت کہنے کے باوجود انہوں نے مولانا سے کوئی خط و کتابت نہیں کی تو میں اپنی جگہ یہ سمجھ کر مطمئن ہو گیا کہ میں نے اپنا حق ادا کر دیا اور میں نے دوسری جلد شائع کر دی۔ وہ مسئلہ بھی خیر اتنا بڑا نہیں تھا۔ اصل میں اس کے ساتھ ہی مولانا نے یہ لکھ دیا تھا کہ جہاں تک تعدّدِ ازدواج (polygamy) کا تعلق ہے وہ ثابت ہے‘ اس میں کوئی اعتراض والی بات نہیں۔

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms22-08 quran aor sunnat ka bahmi taluq.inp 8/20/2014 5:09 PM PAGE 9 (1,1)

لیکن اب یہ جو حدِّ رجم کا مسئلہ سامنے آیا ہے یہ یقیناً ایسی بات ہے جس میں ہماری اُمت میں سے سوائے خوارج کے آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ شیعہ' سنی اور اہل ظاہر سب اس پر متفق ہیں۔ اہل سنت کے چاروں امام' شیعوں میں زیدیہ ہوں یا جعفریہ سب کے سب' اہلِ حدیث علماء' اہل ظاہر میں امام داؤد ظاہری' ان سب کا اجماع ہے کہ اسلام میں شادی شدہ زانی مرد اور شادی شدہ زانیہ عورت کے لیے حدِّ رجم کی سزا ہے۔ لیکن جب مولانا اصلاحی نے اس کے خلاف رائے ظاہر کی اور ایک جلیل القدر صحابی کو جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس نے وہ توبہ کی ہے جو سارے مدینہ والوں پر تقسیم کر دی جائے تو ان کے لیے کافی ہو جائے گی ''غنڈہ'' لکھا تو اب یہ بات ایسی تھی کہ جس سے شدت کے ساتھ اعلانِ براءت کرنا مجھ پر لازم تھا۔ اس لیے کہ میں ہی اس کا پبلشر ہوں' اس تفسیر کو میں نے چھاپا ہے۔ یقیناً مولانا کا مقام اپنا ہے لیکن یہ کہ اس کو چھاپ کر متعارف کرانے میں میرا بھی حصہ ہے' لہٰذا میں نے اس سے اعلانِ براءت کیا اور میں نے کہا کہ میں کم از کم اس معاملے میں مولانا اصلاحی صاحب کو اب منکرینِ سنت کی صف میں سمجھتا ہوں۔ یہ ایک مجمع علیہ شے ہے اور اس سے ہٹ جانا یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے۔

پھر اصلاحی صاحب کے حلقے کے ایک نوجوان نے اس سے بھی آگے بڑھ کر چھلانگ لگائی شروع کی اور ایک غامدیہ خاتون جن کو رسول اللہ ﷺ نے رجم کیا تھا' ان کے بارے میں کہنا شروع کیا کہ وہ چکلہ چلاتی تھیں۔ وہ خاتون جو تین دفعہ آپؐ کے پاس چل کر آئی کہ مجھے پاک کر دیجیے۔ جسے آنحضور ﷺ نے واپس لوٹا دیا۔ اس سے دریافت کیا کہ کہیں تمہیں حمل تو نہیں؟ اس نے کہا حمل تو ہے! فرمایا جاؤ اس ننھی جان کا کیا قصور ہے' جرم ہے تو تمہارا ہے' لہٰذا وضع حمل کے بعد آنا۔ وہ اللہ کی بندی پھر چلی آتی ہے کہ مجھے پاک کر دیجیے' میں آخرت کی سزا نہیں جھیلنا چاہتی' مجھے یہاں پر بڑی سے بڑی سزا منظور ہے۔ خطا کس سے نہیں ہو جاتی؟ لیکن خطا کے بعد توبہ کا یہ معاملہ کہ اللہ کی ایک بندی رجم کی سزا جھیلنے کو تیار ہے' اور اس کے بارے میں اِس قسم کے الفاظ کہے جائیں!

ایک نئے فتنے کا آغاز

جہاں تک اصلاحی صاحب کا معاملہ ہے میں ان کے لیے فتنے کا لفظ استعمال نہیں کرتا۔ میں نے اس معاملے میں فقط اتنا کہا ہے کہ وہ منکرین سنت کی صف میں آ گئے ہیں، لیکن جس نوجوان کا آغاز یہاں سے ہو رہا ہے وہ یقیناً ایک فتنہ اٹھا رہا ہے ☆۔ اصلاحی صاحب تو عمر کے آخری دَور میں ہیں، ان کی خدمات کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ ایک معاملے میں آ کر ان سے بہت بڑی لغزش ہوئی، اس سے ہم نے اعلانِ براءت کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کی پوری زندگی میں کوئی ایسی بڑی چیز نظر نہیں آتی۔ صرف یہی چند چیزیں ہیں جو میں نے عرض کر دیں۔ لیکن ایک ایسی شے جو ائمہ اربعہ کی مجمع علیہ ہے، خلفائے اربعہ کی مجمع علیہ ہے، جس کے بارے میں بخاری و مسلم کی احادیث صحیحہ موجود ہیں، اس سے روگردانی کرنا یقیناً بہت بڑی گمراہی ہے، اور میرے سابقہ تعلق کی وجہ سے میرے ذمے یہ فرض تھا کہ اس معاملے میں اپنا موقف کھل کر سامنے رکھ دوں۔ باقی وہ جو ان کے شاگرد کا مسئلہ ہے اس کے بارے میں مَیں عرض کر چکا ہوں کہ میں اسے فتنہ سمجھتا ہوں۔ اس لیے کہ ایک نوجوان یہ کہے کہ ''کلالہ'' کے معنی آج تک کسی نے نہیں سمجھے، صرف میں نے سمجھے ہیں اور اس کے گرد کچھ ایسے نوجوان بھی جمع ہو جائیں جو یہ مان لیں کہ ہاں اسی نے سمجھے ہیں اور وہ برملا کہے کہ ہم ایک نئی شریعت کی ترتیب کرنے والے ہیں، اس کے فتنہ ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

ایک بات جان لیجیے، دنیا میں جتنے بھی فتنے اٹھے اسی طرح اٹھے۔ عام آدمی تو کوئی فتنہ نہیں اٹھایا کرتا۔ فتنہ تو کوئی باصلاحیت آدمی ہی اٹھایا کرتا ہے۔ غلام احمد قادیانی نے بھی دین کی بڑی خدمت کی تھی جس کی وجہ سے اس کے گرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اس نے مناظروں میں عیسائیوں کو شکستیں دی تھیں، آریہ سماجیوں کو شکستیں دی تھیں تب جا کر

☆ واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا یہ خطاب بائیس سال پہلے کا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہاں جس نوجوان کا ذکر کیا ہے یہ صاحب اب علامہ جاوید احمد غامدی کے نام سے معروف ہیں اور ان کا اٹھایا ہوا فتنہ اس وقت پورے عروج پر ہے۔ (مرتب)

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms22-08 quran aor sunnat ka bahmi taluq.inp 8/20/2014 5:09 PM PAGE 10 (1,1)

لوگ اس کے گرویدہ ہوئے۔ اس کے بعد اُس نے ایک ایک کر کے چیزیں ان کے حلق سے اتروانی شروع کر دیں۔ تو جس کو بھی کسی نئے فتنے کا احساس ہو اور جس کو اللہ تعالیٰ تنبّہ عطا فرمائے اس کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اس بارے میں خبردار کرے۔

اصل میں علماء کو بحیثیتِ مجموعی قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں سے جو اندیشے لاحق ہیں اور ان کے بارے میں ان کا جو ایک allergic attitude ہے اس کا سبب ہی یہی ہے۔ مجھے تو اب علماء کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو رہی ہے کہ جب بھی انہوں نے سنا کہ کوئی شخص قرآن کا نام لے کر اٹھ رہا ہے تو ایک دم ان کے کان کھڑے ہوئے کہ کہیں کوئی اور نئی مصیبت تو نہیں آنے والی؟ کہیں کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھنے والا؟ اس کی وجہ ہی یہی ہے۔ غلام احمد قادیانی آنجہانی نے بھی اپنے کام کا آغاز قرآن سے ہی کیا تھا۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو: ؎

اے بے خبر بخدمتِ قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ برآید فلاں نہ ماند

اور ؎

قمر ہے چاند اوروں کا‘ ہمارا چاند قرآں ہے!

تو یہ سب کچھ اس نے کہا۔ پھر دیکھئے سر سید احمد خان کا اوڑھنا بچھونا قرآن تھا۔ انہوں نے پندرہ پاروں کی تفسیر لکھی جس میں انہوں نے ساری گمراہیاں پھیلائیں۔ جبکہ اہلِ قرآن اور منکرینِ سنت تو معلوم ہوتا ہے قرآن کے ٹھیکیدار ہیں۔

چونکہ قرآن کے نام پر فتنے اٹھتے رہے ہیں لہٰذا ہمیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ آج کل لوگ آثارِ قدیمہ کو کروڑوں روپیہ صرف کر کے محفوظ (preserve) کرتے ہیں‘ تو ہمارے لیے دین کے آثار صحابہ کرامؓ اور ائمۂ دین کی آراء ہیں‘ جو ہمارے لیے بڑے قیمتی ہیں اور ان کو بڑی مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ضرورت ہے۔ ((عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) کے مصداق اگر ہم ان کو دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامیں گے تبھی اس دور کے فتنوں سے بچیں گے۔ ورنہ ایک سے ایک نیا فتنہ آتا ہے اور وہ کچھ نہ کچھ لوگوں کو دین کی طرف سے برگشتہ کر کے انہیں اصل

راستے سے ہٹا کر غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ ایسے فتنے اٹھانے والوں میں کچھ نہ کچھ ذہانت و فطانت اور صلاحیت ہوتی ہے جو لوگوں کو اصل راستے سے ہٹا کر لے جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی الوداعی وصیت

اب ہم ایک حدیث نبویؐ کا مطالعہ کرتے ہیں:

عَنۡ عِرۡبَاضِ بۡنِ سَارِیَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡہُ قَالَ صَلّٰی لَنَا رَسُوۡلُ اللّٰہِ ﷺ صَلَاۃَ الۡفَجۡرِ ثُمَّ وَعَظَنَا مَوۡعِظَۃً بَلِیۡغَۃً ذَرَفَتۡ مِنۡھَا الۡعُیُوۡنُ وَوَجِلَتۡ مِنۡھَا الۡقُلُوۡبُ، فَقَالَ قَائِلٌ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ کَاَنَّھَا مَوۡعِظَۃُ مُوَدِّعٍ فَاَوۡصِنَا، قَالَ: ((اُوۡصِیۡکُمۡ بِتَقۡوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ وَالسَّمۡعِ وَالطَّاعَۃِ وَاِنۡ کَانَ عَبۡدًا حَبۡشِیًّا، فَاِنَّہٗ مَنۡ یَعِشۡ مِنۡکُمۡ بَعۡدِیۡ فَسَیَرٰی اخۡتِلَافًا کَثِیۡرًا، فَعَلَیۡکُمۡ بِسُنَّتِیۡ وَسُنَّۃِ الۡخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیۡنَ الۡمَھۡدِیِّیۡنَ، عَضُّوۡا عَلَیۡھَا بِالنَّوَاجِذِ، وَاِیَّاکُمۡ وَالۡمُحۡدَثَاتِ فَاِنَّ کُلَّ مُحۡدَثَۃٍ بِدۡعَۃٌ وَکُلَّ بِدۡعَۃٍ ضَلَالَۃٌ))......

وَفِیۡ رِوَایَۃٍ: ((وَکُلَّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ))(٦)

''حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد ہمیں ایسا پُر اثر وعظ فرمایا کہ ہماری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور ہمارے دل اس سے لرز گئے۔ ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! یہ تو ایسے لگتا ہے کہ آپؐ نے کوئی الوداعی وعظ فرمایا ہے (یعنی اس انداز سے جیسے آپؐ ہم سے وداع ہو رہے ہیں یا ہمیں وداع کر رہے ہیں) تو ہمیں نصیحت کیجیے! (یعنی اگر یہ علیحدگی کا وقت ہے اور الوداعی خطاب کا انداز ہے تو ہمیں وہ اصول دے دیجیے کہ جنہیں ہم تھام لیں) آپ ﷺ نے فرمایا: ''(سب سے پہلے تو) میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اللہ کے تقویٰ کی، وہ جو العزیز ہے اور بہت جلالتِ شان والا ہے اور (دوسری نصیحت

(٦) سنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الاخذ بالسنۃ واجتناب البدع۔ وسنن ابن ماجہ، المقدمۃ، باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ وسنن الدارمی، المقدمۃ، باب اتباع السنۃ۔ الفاظ کم وبیش سنن دارمی کے ہیں۔ وسنن ابی داوٗد، کتاب السنۃ، باب فی لزوم السنۃ۔

E:\Meesaaq_2006\Me_2006\meesaq september\ma22-08 quran aor sunnat ka bahmi taluq.inp 8/20/2014 5:09 PM PAGE 11 (1,1)

ہے) سننے اور ماننے کی (یعنی اجتماعی نظم وضبط) اگر چہ ایک حبشی غلام تمہارا امیر بنا دیا جائے۔ اس لیے کہ جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تمہارے لیے میری سنت اور ہدایت یافتہ راست رَو خلفاء کی سنت کی پیروی لازم ہے۔ اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ (یہ محاورہ ہے' یعنی کسی کو شدت اور مضبوطی کے ساتھ پکڑ لینا) اور دیکھنا (دین میں) نئی نئی باتیں ایجاد کرنے سے بچتے رہنا' اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے' اور ہر بدعت گمراہی ہے''......اور ایک حدیث میں یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''اور ہر گمراہی آگ میں جھونکی جانے کے قابل ہے''۔

اب میں دو چیزوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ایک یہ کہ خلفائے راشدین سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ خلفائے راشدین یہی خلفائے اربعہ ہیں' یعنی حضرت ابوبکر' حضرت عمر' حضرت عثمان اور حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ میرے نزدیک شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اس کی جو شرح کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے کہ یہاں دونوں خلافتیں مراد ہیں' خلافتِ علمی اور وہ خلافت جو حکومت کی سطح پر قائم ہوئی۔ اس لیے کہ یہاں الفاظ استعمال ہو رہے ہیں: ((سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) اور خلافتِ راشدہ کا جو نظام بعد میں سیاسی طور پر قائم ہوا وہ نظام تو اُس وقت پردۂ غیب میں تھا۔ مراد اس سے یہ ہے کہ میرے خلفاء یا میرے بعد آنے والے وہ لوگ جو راشد ہوں' مہدی ہوں' رشد و ہدایت پر ہوں' ہدایت یافتہ ہوں۔ ان میں یقیناً چاروں خلفاء بھی شامل ہیں جو ہمارے خلفائے راشدین ہیں' ان پر تو اہل سنت کا اجماع ہو گیا۔ اس لیے کہ یہی وہ چار ہیں جن میں اختلاف کی کوئی بات نہیں ہوئی' لیکن اس کے بعد کا معاملہ سیاسی اعتبار سے مختلف فیہ ہے۔ بعد میں آنے والوں میں جو لوگ علمِ نبوت کے وارث بنے' یعنی علماء' ائمۂ دین' فقہاء اور محدثین' یہ بھی یقیناً محمد رسول اللہ ﷺ کے خلفاء میں سے ہیں۔ یہ خلافتِ علمیہ ہے۔ پھر خلافتِ باطنیہ ہے۔ اور خلافتِ ظاہری وہ ہے جس پر حکومت کا نظام ہمارے ہاں چلا ہے۔ البتہ ''خلافتِ راشدہ'' میں یہ تینوں ایک وحدت ہیں۔ باطنی خلافت' علمی خلافت اور سیاسی خلافت یہ تینوں جمع ہو گئی ہیں حضرت

ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم کی ذات میں۔ لیکن بعد میں پھر تقسیم ہوتی چلی گئی۔ ایک خلافت سیاسی رہ گئی، ایک خلافت علمی اور ایک خلافت باطنی۔ اس کے علاوہ روحانی خلافتوں کا جو سلسلہ ہمارے ہاں بیعت کی بنیاد پر چلا ہے اور جو ہماری ساری روایات ہیں ان میں سے کوئی بھی درحقیقت اس ڈگر سے ہٹ کر نہیں ہے۔

دوسری بات اس ضمن میں نوٹ کرنے کی یہ ہے کہ بدعت محض کسی رسم کا نام نہیں، دین میں نیا خیال ظاہر کرنا اور بالکل مجمع علیہ چیزوں کے خلاف کوئی نئی رائے دینا بھی یقیناً بدعت میں شامل ہے، اس لیے کہ بدعت صرف عمل کا نام نہیں۔ نیا خیال بھی بدعت ہے، نیا نظریہ بھی بدعت ہے، وہ چیز جو دین کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو وہ بھی بدعت ہے۔

متذکرہ بالا آیت کے الفاظ ﴿وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ﴾ ''اور جو کوئی مخالفت کرے رسولؐ کی'' کا مصداق رسولؐ کے ساتھ ساتھ سنتِ رسولؐ بھی ہے، اور ﴿وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ''اور چلے مسلمانوں کی راہ کے خلاف''...... اس ''سبیل المؤمنین'' کی وضاحت میں کر چکا ہوں کہ یہ کن ذرائع (channels) سے وجود میں آئی ہے۔ جو کوئی اس سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالے گا، چاہے وہ کوئی رسم ہو، کوئی خیال ہو، کوئی رائے ہو وہ راستہ قابل قبول نہ ہوگا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک رائے اکیلی نہیں ہوتی، اس کا پورا کنبہ ہوتا ہے۔ ایک نئی رائے آئے گی تو اس رائے کے ساتھ ملی ہوئی چیزیں اس میں شامل ہوتی چلی جائیں گی۔ چنانچہ اس نئے مکتبہ فکر کے روبرو ایک مرتبہ جب گفتگو ہو رہی تھی اور میں نے یہ بات کہی کہ آپ ایک بالکل نیا دین ایجاد کر لیں گے تو انہوں نے کہا ''نیا دین نہیں، نئی شریعت، نئی فقہ ہم ضرور بنانا چاہتے ہیں''۔ بہرحال میں ان حضرات کے طرزِ عمل سے اعلانِ براءت کرتا ہوں اور یہ بات پوری طرح واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں کسی compromise کی گنجائش نہیں۔ اگر دین کے کسی معاملے میں ہم نے مداہنت کا راستہ اختیار کیا اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین کوئی تفریق کرنے کی کوشش کی تو ہماری یہ ساری محنتیں اکارت چلی جائیں گی اور ان کا حاصل کچھ نہ ہوگا۔

ہم اُس قرآن کے ماننے والے ہیں جو محمدؐ رسول اللہﷺ پر نازل ہوا‘ اور آپؐ پر صرف قرآن ہی نازل نہیں ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی رہنمائی بہت سے طریقوں (channels) سے کی۔ اس پر تو علماء نے کتابوں کی کتابیں لکھ دی ہیں اور بیسیوں مثالیں دی ہیں۔ مثلاً یہ جو سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ط﴾ (آیت ۱۴۳) ’’اور ہم نے نہیں مقرر کیا تھا وہ قبلہ جس پر کہ آپ تھے مگر اس لیے کہ ہم ذرا جانچ لیں کہ کون رسولؐ کی پیروی کرتا ہے اور کون اُلٹے پاؤں پھر جاتا ہے‘‘۔ غور کیجیے قرآن مجید میں کہاں ہے وہ آیت جس کی تعمیل میں رسول اللہﷺ نے بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھی؟ تو معلوم ہوا کہ کوئی اور چینل ہے جس کے ذریعے آپﷺ کو وہ بات کہی گئی تھی‘ کوئی اور بصیرتِ باطنی تھی جس کے ذریعے آپؐ کو یہ ہدایت دی گئی تھی۔ اس طرح کی بیسیوں مثالیں آپ کو مل جائیں گی جن سے ثابت ہو جائے گا کہ محمدؐ رسول اللہﷺ کو صرف قرآن ہی نہیں مل رہا تھا‘ بلکہ اللہ تعالیٰ کی راہ نمائی بہت سے دوسرے چینلز سے بھی آپؐ کے پاس آ رہی تھی۔ جیسا کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ((اُوْتِیْتُ الْكِتَابَ وَمِثْلَهٗ مَعَهٗ)) ’’مجھے قرآن بھی دیا گیا اور اس جیسی چیز اور بھی‘‘۔ یہی وہ چیز ہے جس نے سنت کی شکل میں ظہور کیا۔

سنت اور حدیث کا فرق

اب سنت اور حدیث کا فرق بھی سمجھ لیجیے۔ سنت درحقیقت کہتے ہیں سیرت‘ راستے اور طریقے کو۔ (السنة فی الاصل الطریقة والسیرة) رسول اللہﷺ کا جو راستہ اور طریقہ ہے اس کا علم ہمارے پاس دو واسطوں سے پہنچا ہے۔ اوّلاً تواترِ عمل اور ثانیاً حدیث کا ریکارڈ۔ ان میں سے اہم تر واسطہ یا ذریعہ اُمت کا تواترِ عمل ہے۔ نبیﷺ کو دیکھ کر صحابہؓ نے عمل کیا‘ صحابہ کو دیکھ کر تابعین نے اور تابعین کو دیکھ کر تبع تابعین نے عمل کیا۔ اس طرح یہ نسلاً بعد نسلٍ دیکھ کر منتقل ہو رہا ہے۔ بالکل اسی طور سے قرآن منتقل ہوا ہے۔ رسول اللہﷺ سے صحابہؓ نے سنا اور یاد کیا اور پھر صحابہ سے اگلوں نے سنا اور یاد

کیا‘ اسی طرح یہ آگے چلتا گیا اور نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا گیا۔ رسول اللہﷺ نے اسے باقاعدہ چھپوا کر اس پر دستخط کر کے اور سرٹیفکیٹ دے کر اس کے نسخے تو دنیا کے اندر نہیں بھیجے تھے۔ قرآن تو رسول اللہﷺ کی اپنی حیاتِ طیبہ تک مابین الدُّفَّتَین بھی جمع نہیں ہوا تھا۔ وہ تو بعد میں دورِ صدیقیؓ میں جمع ہوا۔

چنانچہ اوّل درجے میں اللہ کے رسولﷺ کا عمل ہے جس پر اُمت کا تواترِ عمل ہے اور پھر ثانوی درجے میں حدیث کا ریکارڈ ہے۔ اب حدیث کا ریکارڈ جمع کرنے کا جب مرحلہ آیا تو بہت سی چیزیں ایسی ہوسکتی ہیں کہ جن کی وجہ سے کوئی حدیث اس معیار پر پوری نہ اتر رہی ہو۔ ہوسکتا ہے اس کا اصل راوی فوت ہو چکا ہو اور اس کی بجائے کوئی دوسرے درجے کا راوی اسے روایت کرر ہا ہو۔ اس طرح کے سارے امکانات موجود ہیں۔ لیکن تواترِ عمل میں اس طرح کا کوئی خلا پیدا نہیں ہوسکتا‘ لہٰذا سنت کے علم کا زیادہ بڑا ذریعہ (source) ہمارے پاس امت کا تواترِ عمل ہے‘ جس نے سبیل المؤمنین کی شکل اختیار کی ہے اور اصل میں اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ اہل ایمان کے اِس راستے سے ہٹ کر کوئی راستہ نکالنے کی کوششیں ہر دَور میں ہوتی رہی ہیں۔ ہر دَور اور ہر زمانے کے اپنے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ جب یونان کی منطق آئی تو بہت سے لوگوں کو بہا کر لے گئی تھی۔ ایک دَور میں جدید سائنس کے زیر اثر سر سید احمد خان اور اُن کے حلقۂ اثر نے کچھ رائیں ایجاد کر لیں۔ لیکن یہ وقتی قسم کے معاملات ہوتے ہیں۔ ہمارا جو تسلسل ہے تواترِ عمل کا اور اس سے جو سبیل المؤمنین بنی ہے اس کی پیروی ہم پر لازم ہے۔ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اِن شاء اللہ قرآن مجید کی اس پوری تحریک اور دعوت کو لے کر چلیں گے اور کہیں بھی سبیل المؤمنین سے اپنا راستہ ہٹا لینے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ اس لیے کہ اسی میں عافیت اور حفاظت ہے۔ یہی ہمارے نزدیک قرآن کی رو سے اور سنتِ رسولﷺ کے اعتبار سے صحیح راستہ ہے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

(مرتب: حافظ خالد محمود خضر)

تلبیسِ ابلیس

یعنی

ابلیس کی چالیں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

انسان فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ ہر انسان میں فطری کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ آیا وہ ان کمزوریوں کا شکار (victim) بن جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان فطری کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ مال اور اولاد کی محبت' حرص و ہوا' حبِّ جاہ' غصہ' جلد بازی' سہل پسندی' برتری کی خواہش اور دوسروں پر حاکم بننے کی تمنا' یہ وہ کمزوریاں ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اِن کمزوریوں کو اپنے مزاج کا حصہ نہ بنالے' بلکہ اسلامی تعلیمات کی حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے ان پر کنٹرول کرے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے' اُس کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ بندے کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے' اسے گمراہ کرے اور ناکام بنا دے۔ پس ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ چوکنا اور ہوشیار رہے' شیطان کے حملوں سے خبردار رہے۔ یاد رہے کہ کوئی چھوٹا' بڑا' نمازی' پرہیزگار' صالح' متقی' عام مسلمان' عابد' زاہد' عالم' فاضل' پیر' مرید' امام اور مقتدی وغیرہ کوئی بھی شیطان کے حملوں سے محفوظ نہیں۔ اُس نے صاحبِ کرامت اولیاء پر بھی حملے کیے جن میں سے بالآخر کچھ کو ہلاکت میں ڈالنے میں کامیاب بھی ہو گیا' جس کی ایک مثال بنی اسرائیل کا ایک مستجاب الدعوات صالح شخص بلعم بن باعوراء ہے جسے شیطان اغوا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم کے مطابق ذبح کرنے کے لیے لے کر چلے تو انہیں بھی شیطان نے بہکانے کی کوشش کی اور کہا: اس خیال پر عمل کرنے سے رک جاؤ! کیا کبھی کسی انسان نے اپنے بیٹے کو بھی ذبح کیا ہے؟ ایسے ہی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں شیطان کی شیطنت کا قصہ تو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے آدم علیہ السلام کو سبز باغ دکھائے' جھوٹے وعدے کیے' قسمیں کھائیں اور انہیں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے پر آمادہ کرلیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں نقل ہوا ہے کہ: ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ......﴾ (یوسف:۵۳) ''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا' یقیناً نفس تو برائی پر بہت اُبھارنے والا ہے''۔

اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنۡكُمۡ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدۡ وُكِّلَ بِهٖ قَرِيۡنُهٗ مِنَ الۡجِنِّ)) قَالُوۡا وَاِيَّاكَ يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ؟ قَالَ : ((وَاِيَّایَ اِلَّا اَنَّ اللّٰهَ اَعَانَنِیۡ عَلَيۡهِ فَاَسۡلَمَ فَلَا يَاۡمُرُنِیۡ اِلَّا بِخَيۡرٍ)) (۱)

''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان مقرر کیا گیا ہے''۔ صحابہؓ نے کہا: ''اور آپ کے ساتھ بھی یارسول اللہ ﷺ! آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' مگر میں نے اللہ کی مدد سے اسے مسلمان کرلیا ہے' چنانچہ وہ مجھے بس نیکی ہی کا مشورہ دیتا ہے''۔

قرآن مجید میں شیطان کو اَلۡغَرُوۡرُ (بڑا دھوکے باز) کہا گیا ہے۔ اس کا ورغلانا اتنا سادہ نہیں کہ وہ کسی نمازی کو نماز چھوڑنے کا حکم دے یا بُت کو سجدہ کرنے کو کہے۔ اس کا حملہ عام طور پر بڑا باریک' لطیف اور خفیہ ہوتا ہے۔ نیکی کے کام کی مشقت اٹھانے والوں کو وہ یوں فریب دیتا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے' اُس کی شانِ غفاریت پر پورا بھروسہ کرو' رات جاگ کر عبادت کرنے اور سردیوں میں صبح صبح ٹھنڈے پانی کے ساتھ وضو کرنے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں' اُس کو بھلا تمہاری عبادت کی کیا ضرورت ہے! چنانچہ انسان نفسانی خواہش کی اتباع میں شیطان کے وسوسے کا شکار ہو جاتا ہے۔ سورۃ فاطر میں ہے:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الۡحَيٰوةُ الدُّنۡيَا ٚ وَلَا يَغُرَّنَّكُمۡ

(۱) صحيح مسلم' كتاب صفة القيامة والجنة والنار' باب تحريش الشيطان وبعثه سراياه لفتنة الناس...... الخ۔

بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَـكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۝ (آیات ۵'۶)

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے' پس تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تمہیں بڑا دھوکے باز (شیطان) دھوکے میں ڈالے۔ بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے' پس اس کو دشمن ہی سمجھو''۔

شیطان ماہر دھوکے باز ہے۔ وہ اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ آدمی کو بالکل احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ دھوکہ کھا رہا ہے۔ شیطان ہمدرد اور خیر خواہ بن کر دھوکہ دیتا ہے۔ وہ شر کے اندر خیر دکھاتا ہے۔ وہ دولت مند کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے روکتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ ابھی تمہاری مکان بنانے' اولاد کی شادیاں کرنے اور گاڑی خریدنے جیسی ضروریات ہیں۔ اگر یہ سب کچھ پہلے ہی سے میسر ہو تو بھی وہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ غریب لوگ خود محنت کیوں نہیں کرتے؟ خود محنت کریں اور کمائیں' جیسا کہ ہم نے محنت کی اور اتنی دولت اکٹھی کر لی' اگر یہ محنت نہیں کرتے تو ان کو بھوک پیاس برداشت کرنی چاہیے۔ شیطان کہتا ہے کہ یہ تمہارا محنت سے کمایا ہوا روپیہ ہے' زکوٰۃ دو گے تو ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار چلے جائیں گے اور پھر لاکھ پورا نہیں رہے گا۔

نفس کے لالچ سے بچنا تو واقعی بڑی ہمت کا کام ہے۔ نوجوانوں کو شیطان موت کے لفظ سے وحشت دلاتا ہے۔ انہیں مطمئن کرتا ہے کہ یہ وقت تو عیش و عشرت کا ہے' ابھی سے تفکرات میں گھر جانا عقل مندی نہیں ہے' جیسے دل چاہے کرو' دوستوں میں بیٹھ کر دادِ عیش دو' اچھا کھاؤ' اچھا پہنو۔ رہا نماز روزہ تو یہ بزرگوں کے کرنے کے کام ہیں' جب بڑی عمر کے ہو جاؤ گے تو نماز روزہ کر لینا' ابھی تو بڑی زندگی پڑی ہے۔ شیطان موت کے تصور کو اُن سے دُور رکھتا ہے۔ یوں نوجوان بھولے سے بھی موت کو یاد نہیں کرتا۔ زبان سے تو سبھی کہتے ہیں کہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے' مگر اپنی موت کے وقت کو ہر کوئی دُور سمجھتا ہے۔

ایسے ہی درازیٔ عمر کی تمنا بوڑھوں کو نوجوانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ شیطان اس انسانی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے اگرچہ تم بوڑھے ہو چکے ہو' اعضاء کمزور ہو گئے ہیں' مگر ابھی تو تم سے بڑی عمر کے لوگ بھی زندہ ہیں۔ تمہاری موت تو بہت دُور ہے۔ بوڑھے لوگ شیطان کے اس فریب میں آ کر توبہ کی طرف نہیں آتے۔ چہرے پر داڑھی سجانا انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے' رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ ﷺ کا حکم ہے' لیکن کتنے ہی بوڑھے ایسے ہیں کہ سفید بالوں والی داڑھی کو چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتے' حالانکہ رسول

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms08-09 talbees-e-iblees.inp 8/20/2014 5:02 PM PAGE 2 (1,1)

اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ سفید بالوں کو سزا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو حیا آتی ہے‘ یعنی یہ سفید بال بھی نجات کا باعث بن سکتے ہیں‘ مگر دھوکے باز شیطان کا فریب ایسا ہے کہ نجات کا یہ راستہ بھی بند کرا دیتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خواہشات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوتی ہیں۔ شیطان لمبی عمر کی اُمید دلا کر بوڑھوں کو معمول کی مصروفیات میں الجھائے رکھتا ہے۔ وہ صدقہ و خیرات اور نیکی کے دوسرے کاموں کو آنے والے وقت پر ٹالتے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہیں نیکی کرنے کی توفیق میسر نہیں آتی اور عزرائیل اچانک آ دھمکتا ہے‘ اُس وقت حسرت و یاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور شیطان اپنی کارگزاری پر پھولا نہیں سماتا۔

جس طرح شیطان امیروں اور دولت مندوں کو دولت کی نمائش کے نت نئے طریقے سکھاتا ہے اسی طرح غریبوں کو بھی الٹی پٹیاں پڑھاتا ہے۔ انہیں کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کے پاس ڈھیروں دولت ہے جو انہوں نے غریبوں کا خون نچوڑ کر یا دیگر حرام ذرائع سے حاصل کی ہے۔ ان کی دولت کو ہر طرح سے لوٹنا جائز ہے۔ چنانچہ غریب اس فریب میں آ کر ڈاکے ڈالتے‘ چوریاں کرتے اور قتل و غارت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ شیطان امیروں کو اسراف و تبذیر کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے بسبب غریبوں میں امیروں کے خلاف حسد کے جذبات پروان چڑھاتا اور نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ دشمنی کے جذبات کے زیر اثر دولت مندوں کے نقصان پر خوش ہوتے ہیں‘ بلکہ انہیں نقصان پہنچا کر اطمینان محسوس کرتے ہیں‘ حالانکہ کسی دولت مند کی دولت چھیننا تو کسی طور بھی جائز نہیں۔

شیطان عالموں‘ واعظوں اور خطیبوں کو بھی راہِ راست سے ہٹانے سے نہیں چوکتا۔ وہ دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنے کو کافی سمجھتے ہیں‘ اس طرح بزعمِ خویش وہ بہت زیادہ ثواب اکٹھا کرتے ہیں‘ مگر اپنے نفس کی اصلاح کی طرف سے انہیں شیطان دُور رکھتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ: ۴۴) ’’کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟‘‘ چنانچہ اکثر واعظ اور خطیب بے عملی بلکہ بدعملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لوگ اُن کے علم و فضل اور خطبہ و وعظ اور حسنِ صوت سے متأثر ہو کر اُن کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں اور ادب و احترام بجا لاتے ہیں‘ جس سے اُن کے اندر رعونت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو واقعی دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح شیطان کا حملہ علماء‘ فضلاء اور مذہبی راہنماؤں پر بھی کارگر ثابت ہوتا ہے‘ جبکہ وہ اپنے آپ کو شیطان کے حملوں سے محفوظ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

عام مسلمانوں کو گمراہ کرنا تو شیطان کا بائیں ہاتھ کا کام ہے' وہ بڑی آسانی سے انہیں مشرکانہ کاموں اور بدعات میں ملوث کر لیتا ہے۔ نیک لوگ اور بزرگ فوت ہو جائیں تو اُن کی قبریں پختہ بنانے کو عقیدت اور احترام کی علامت بتاتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہﷺ نے سختی کے ساتھ اس عمل سے روکا ہے اور خود آپﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ کی تین بیٹیاں آپؐ کے سامنے فوت ہوئیں' آپؐ نے اُن کا کفن دفن کیا مگر کسی کی قبر پختہ نہیں بنائی' بلکہ آپؐ نے حیاتِ دُنیوی کے آخری لمحات میں جو اہم باتیں تاکیداً ارشاد فرمائیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسْجِدًا))(۱)

''اللہ کی لعنت ہو یہود ونصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔''

جب انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی تاکیدی ممانعت ہے تو اولیاء اللہ اور صلحائے اُمت کی قبروں پر سجدے کی اجازت کیسے ہوسکتی ہے؟ مگر شیطان ہے کہ وہ کلمہ گو مسلمانوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے' اور وہ گروہ در گروہ مزاروں پر حاضری دیتے' دعائیں مانگتے' حاجتیں طلب کرتے' قبروں کو بوسہ دیتے' چادریں چڑھاتے' غسل دیتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ واقعی شیطان کا فریب بڑا کاری ہے' اس لیے کہ وہ سب سے بڑا دھوکے باز ہے۔

بدعات کو رواج دینا شیطان کا دل پسند اور مؤثر ترین ہتھیار ہے۔ رسول اللہﷺ نے بدعات سے سختی سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے: ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''ہر بدعت گمراہی ہے''۔ یہ ہدایت بڑی اہم ہے' کیونکہ دین تو مکمل ہو چکا ہے' اس میں کسی اضافے کی گنجائش پیدا کر لینا دین کو نامکمل سمجھنا ہے۔ ایک عید میلاد ہی کو لیجیے۔ اسلام میں تو صرف دو عیدیں ہیں' جن کے پروگرام ہمیں بتا دیے گئے ہیں۔ شیطان نے نبی اکرمﷺ کے ساتھ محبت کا آسان طریقہ ایجاد کر کے مسلمانوں میں رائج کر دیا ہے' حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہﷺ سے سچی اور حقیقی محبت تھی۔ وہ آپؐ کی ہر سنت کو اپنانے والے تھے' مگر نہ تو رسول اللہﷺ نے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عید منائی' مگر شیطان ہے کہ اس کو تیسری عید کے طور پر رائج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس عید کا پروگرام رسول اللہﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں ہے لہٰذا ہر کوئی اپنے ہی طریقے سے اسے منا رہا ہے۔ کوئی مصنوعی

---

(۱) صحيح البخارى' كتاب الجنائز' باب ما يكره من اتخاذ المساجد على القبور ـ وصحيح مسلم' كتاب المساجد ومواضع الصلاة' باب النهى عن بناء المساجد على القبور واتخاذ الصور۔

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms08-08 talbees-e-iblees.inp 8/20/2014 5:02 PM PAGE 3 (1,1)

پہاڑیاں بنا رہا ہے‘ کوئی جلوس نکال رہا ہے‘ کوئی موسیقی کی دھنوں پر نعتیں گا رہا ہے اور کوئی میلاد کا جلسہ منعقد کر کے اس عید کو قرآن سے ثابت کرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ بے سود اِس لیے کہ اگر یہ عید قرآن سے ثابت ہو تو ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہﷺ نے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کی کچھ آیات پر عمل نہیں کیا‘ اور یہ محال ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سی بدعات ہیں جن کو رواج دے کر شیطان نے اکثر مسلمانوں کو گمراہی کے تاریک غار میں دھکیل دیا ہے۔

شرک ایسا عمل ہے کہ آخرت میں اس کی بخشش نہیں۔ شرک کرنے والے کے تمام اعمال ضائع چلے جاتے ہیں‘ کیونکہ شرک بخشش کی راہ میں کافی رکاوٹ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

(النّساء:۴۸ و ۱۱۶)

’’یقیناً اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے‘ البتہ اس کے ماسوا (گناہ) جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا‘‘۔

اس بات کا شیطان کو بھی علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے‘ لہٰذا شیطان کی یہ خواہش ہے کہ لوگوں سے شرک کا ارتکاب کرا کے انہیں اپنی پارٹی (حزب الشیطان) کا ایک فرد بنا لے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمہ گو تو مشرک نہیں ہو سکتا‘ مگر ایسا نہیں ہے۔ کلمہ گو کو شرکیہ افعال کرنے کی کھلی چھٹی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والا بھی مشرک ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ۝۱۰۶﴾ (یوسف)

’’اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود مشرک ہیں‘‘۔

مسلمانوں کو اس ناقابلِ بخشش گناہ سے دُور رہنے کی جتنی زیادہ ضرورت ہے اتنا ہی وہ شیطان کے فریب میں آ کر اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ وہ اللہ کے سوا دوسروں سے استمداد کرتے‘ دعائیں مانگتے‘ ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے اور اُن کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی صفات مخلوق میں تسلیم کرتے ہوئے کسی کو قادر‘ کسی کو عالم الغیب‘ کسی کو دستگیر‘ کسی کو داتا‘ کسی کو مشکل کشا اور کسی کو نفع و نقصان کا مالک مان لیتے ہیں‘ حالانکہ یہ ساری صفات خاص (exclusively) اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ جب شیطان لوگوں سے شرکیہ اعمال کا ارتکاب کرا لیتا ہے تو اُس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی‘ کیونکہ وہ وعدۂ خداوندی کے مطابق ایسے شخص پر جنت

کے دروازے بند کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّهٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰهِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیۡهِ الۡجَنَّةَ وَمَاۡوٰٮهُ النَّارُ ؕ﴾ (المائدۃ:۷۲) ''یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اللہ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

درود شریف پڑھنے کے بڑے فضائل ہیں۔ درود شریف کے الفاظ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں۔ پھر ان میں سب سے زیادہ فضیلت والا درود دَرودِ ابراہیمی ہے جس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں شامل کر دیے ہیں۔ درود شریف کے وہ الفاظ جو رسول اللہ ﷺ نے اُمت کو سکھائے ہیں، بلاشبہ انتہائی خوبصورت اور افضل ہیں، مگر شیطان نے یہاں بھی لوگوں کو چکر دیا ہے۔ انہوں نے درود شریف کے نام سے خود بھی کچھ عبارتیں بنالی ہیں اور اُن کے خودساختہ فضائل لوگوں کو بتائے ہیں۔ بھولے بھالے لوگ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ کو چھوڑ کر انسانوں کے بتائے ہوئے درود شریف پڑھ رہے ہیں، اُن بیچاروں کو یہ نہیں پتا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے مقابل کسی دوسرے کے الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں۔ خودساختہ درود شریف کو ہم نعت کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر اس میں بھی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے شرکیہ الفاظ شامل ہو گئے تو وہ نعت بھی نہ رہی بلکہ ارتکابِ شرک کا موجب بن گئی۔ شیطان انسان کے ذہن سے یہ حقیقت آسانی سے مٹا دیتا ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کا مقام تمام کائنات سے بلند ہے اسی طرح آپ ﷺ کے بتائے ہوئے درود شریف کے الفاظ یا اَوراد و وظائف بھی انتہائی جامع اور افضل ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے لوگوں کے خودساختہ الفاظ اپنا نافریبِ نفس کے علاوہ کچھ نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ انسان اپنا جائزہ لیتا رہے اور خیال رکھے کہ اس کا عمل اسوۂ رسول اور تعلیمِ رسول ﷺ کے مطابق ہو۔ کیونکہ اُمت کا ہر فرد بڑا ہو یا چھوٹا بالفاظِ قرآن اس بات کا پابند ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ دیں وہ لے لے اور جس سے وہ روکیں اُس سے رک جائے۔ یہ حیثیت اُمت میں سے کسی اور کی نہیں۔

❁ ❁ ❁

شبِ برات

احادیث مبارکہ کی روشنی میں

ایک تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ

حافظ محمد زبیر

ہمارے ہاں شبِ برات کے حوالے سے دو انتہائیں پائی جاتی ہیں۔ایک طرف متشدّد دین ہیں جو اسے بدعت قرار دیتے ہیں اور اس سے متعلقہ روایت کردہ تمام احادیثِ مبارکہ کو ضعیف یا موضوع سمجھتے ہیں۔جبکہ دوسری طرف جہلاء ہیں جنہوں نے اغیار کی نقالی کرتے ہوئے بہت ساری رسومات و بدعات کو بھی اِس رات عبادت کا ایک حصہ بنالیا ہے۔اس مضمون میں احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان امور کا جائزہ لیا گیا ہے جن کا کرنا ماہِ شعبان یا شبِ برات میں مستحب و مستحسن ہے اور ان خرافات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے جن کو عبادت کے نام پر دین کا ایک حصہ بنالیا گیا۔علامہ البانی نے ماہِ شعبان اور شبِ برات کے حوالے سے تقریباً ایک سو پینتیس (۱۳۵) صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع روایات کو مختلف کتبِ احادیث میں بیان کیا ہے۔اِن کے علاوہ بھی بعض دوسرے علماء نے کتبِ تفسیر وغیرہ میں کچھ روایات کا تذکرہ کیا ہے۔اس مضمون کو ترتیب دیتے وقت میں نے ان تمام روایات کو سامنے رکھا اور مکررات کو حذف کرتے ہوئے ایک ہی موضوع کو بیان کرنے والی احادیث میں سے جامع احادیث کو بیان کر دیا ہے، تاکہ مقصد کے حصول کے ساتھ ساتھ غیر ضروری طوالت سے بھی بچا جاسکے۔حدیث پر حکم لگاتے وقت علامہ البانی کی تحقیق و تخریج سے استفادہ کیا گیا ہے۔اس مضمون میں حدیث کی کچھ بنیادی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے جن کا تعارف مَیں عام قارئین کے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔

حدیث کی بنیادی طور پر دو اقسام ہیں۔ایک ''مقبول'' یعنی جس کو قبول کیا جائے اور دوسری ''مردود'' یعنی جس کو ردّ کر دیا جائے۔''مقبول'' روایت وہ ہے جو احکامِ شرعیہ کے ثبوت کے لیے دلیل بن سکے اور ''مردود'' روایت وہ ہے جو احکامِ شرعیہ کے ثبوت کے لیے دلیل نہ بن سکے۔''مقبول'' روایت کی دو قسمیں ''صحیح'' اور ''حسن'' ہیں جبکہ باقی تمام اقسامِ حدیث مثلاً ضعیف، موضوع اور منکر وغیرہ ''مردود'' ہیں، جن کو دین کے کسی معاملے میں حجت نہیں بنایا جاسکتا۔

مضمون کو آسانی کی خاطر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔پہلے حصے میں ماہِ شعبان کی فضیلت سے متعلقہ روایات کو جمع کیا گیا ہے جبکہ دوسرے حصے میں شب برات کی احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔

ماہِ شعبان کی فضیلت میں صحیح روایات

۱) عَنْ اَبِی سَلَمَۃَ اَنَّ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا حَدَّثَتْہُ قَالَتْ لَمْ یَکُنِ النَّبِیُّ ﷺ یَصُوْمُ شَھْرًا اَکْثَرَ مِنْ شَعْبَانَ فَاِنَّہٗ کَانَ یَصُوْمُ شَعْبَانَ کُلَّہٗ وَ کَانَ یَقُوْلُ:((خُذُوْا مِنَ الْعَمَلِ مَا تُطِیْقُوْنَ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوْا)) (۱)

''حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے بیان کیا کہ اللہ کے نبی ﷺ شعبان سے زیادہ کسی مہینے میں روزے نہ رکھتے تھے۔آپؐ شعبان کا سارا مہینہ روزے رکھتے اور کہا کرتے تھے: ''اتنا عمل کرو جس کی تم استطاعت رکھتے ہو۔بے شک اللہ تعالیٰ (اجر دینے سے) نہیں اُکتاتا، یہاں تک کہ تم (عمل سے) اکتا جاؤ۔''

۲) عَنْ اَبِی سَلَمَۃَ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا عَنْ صِیَامِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالَتْ کَانَ یَصُوْمُ حَتّٰی نَقُوْلَ قَدْ صَامَ وَیُفْطِرُ حَتّٰی نَقُوْلَ قَدْ اَفْطَرَ وَلَمْ اَرَہٗ صَائِمًا مِنْ شَھْرٍ قَطُّ اَکْثَرَ مِنْ صِیَامِہٖ مِنْ شَعْبَانَ، کَانَ یَصُوْمُ شَعْبَانَ کُلَّہٗ کَانَ یَصُوْمُ شَعْبَانَ اِلَّا قَلِیْلًا (۲)

''حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کے (نفلی) روزوں کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ آپؐ اتنے دن روزہ رکھتے تھے کہ ہم کہتے کہ آپؐ نے بہت روزے رکھے اور آپؐ اتنے دن روزہ نہ رکھتے کہ ہم کہتے کہ آپؐ نے بہت دن روزہ نہیں رکھا۔اور میں نے آپؐ کو شعبان کے مہینے سے زیادہ کسی مہینے میں (نفلی) روزے رکھتے نہیں دیکھا۔آپؐ شعبان کا سارا مہینہ روزہ رکھتے تھے، آپؐ شعبان کا سارا مہینہ روزہ رکھتے تھے سوائے چند دن کے۔''

۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

کَانَ اَحَبَّ الشُّھُوْرِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ اَنْ یَصُوْمَہٗ شَعْبَانُ (۳)

''اللہ کے رسول ﷺ کو سب مہینوں میں سے شعبان میں روزہ رکھنا زیادہ پسند تھا۔''

اس حدیث میں نفلی روزے مراد ہیں نہ کہ فرض روزے ورنہ اس اعتبار سے اللہ کے رسول ﷺ کو سب سے زیادہ رمضان کا مہینہ پسند تھا۔

۴) عَنْ اَبِی ھُرَیْرَۃَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ:((اِذَا بَقِیَ نِصْفٌ مِنْ شَعْبَانَ فَلَا تَصُوْمُوْا)) (۴)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جب نصف شعبان باقی رہ جائے (یعنی نصف شعبان گزر جائے) تو روزہ نہ رکھو۔''

اس حدیثِ مبارکہ میں اللہ کے رسول ﷺ نے نصف شعبان کے بعد اپنی اُمت کو اس لیے روزہ رکھنے سے منع فرمایا کہ مبادا رمضان کے فرض روزوں میں کوتاہی اور سستی ہو جائے۔

٥) عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھَا اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَصُوْمُ شَعْبَانَ کُلَّہٗ قَالَتْ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ أَحَبُّ الشُّھُوْرِ اِلَیْکَ اَنْ تَصُوْمَہٗ شَعْبَانَ قَالَ: ((اِنَّ اللّٰہَ یَکْتُبُ فِیْہِ کُلَّ نَفْسٍ مَیِّتَةٍ تِلْکَ السَّنَةِ فَاُحِبُّ اَنْ یَاْتِیَنِیْ اَجَلِیْ وَاَنَا صَائِمٌ))(٥)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ شعبان کا سارا مہینہ روزہ رکھتے تھے۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ سب مہینوں میں سے شعبان کے مہینے میں روزہ رکھنا زیادہ پسند کرتے ہیں، تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اس مہینے میں اس سال مرنے والوں کے نام لکھ دیتے ہیں اور مجھے یہ بات پسند ہے کہ میری موت کے بارے جب فیصلہ کیا جائے تو میں روزے کی حالت میں ہوں۔''

مذکورہ بالا احادیث سے یہ پتا چلتا ہے کہ شعبان کے مہینے میں روزہ رکھنا مستحب و مستحسن امر ہے۔

ماہِ شعبان کی فضیلت میں حسن روایت

١) حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

شَعْبَانُ بَیْنَ رَجَبَ وَشَھْرِ رَمَضَانَ تَغْفُلُ النَّاسُ عَنْہُ تُرْفَعُ فِیْہِ اَعْمَالُ الْعِبَادِ فَاُحِبُّ اَنْ لَّا یُرْفَعَ عَمَلِیْ اِلَّا وَاَنَا صَائِمٌ (٦)

''شعبان، ماہِ رجب اور ماہِ رمضان کے درمیان ایک ایسا مہینہ ہے کہ جس سے لوگ غافل رہتے ہیں، حالانکہ اس میں لوگوں کے اعمال اوپر اٹھائے جاتے ہیں۔ اور میں یہ بات پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال اس حال میں اوپر اٹھائے جائیں کہ میں روزے کی حالت میں ہوں۔''

ماہِ شعبان کی فضیلت میں ضعیف روایات

١) عَنْ اَنَسٍ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ اَیُّ الصَّوْمِ اَفْضَلُ بَعْدَ رَمَضَانَ؟ فَقَالَ: ((شَعْبَانُ)) (٧)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے سوال کیا گیا کہ رمضان کے بعد کون سا روزہ افضل ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''شعبان۔''

٢) ((شَھْرُ رَمَضَانَ شَھْرُ اللّٰہِ وَشَھْرُ شَعْبَانَ شَھْرِیْ، شَعْبَانُ الْمُطَھِّرُ وَرَمَضَانُ الْمُکَفِّرُ)) (٨)

''رمضان اللہ کا مہینہ ہے اور شعبان میرا مہینہ ہے۔ شعبان (گناہوں سے) پاک کرنے والا ہے جبکہ رمضان (گناہوں کو) مٹانے والا ہے۔''

ماہِ شعبان کی فضیلت میں موضوع روایات

١) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

اِنَّمَا سُمِّیَ شَعْبَانُ لِاَنَّہٗ یَتَشَعَّبُ فِیْہِ خَیْرٌ کَثِیْرٌ لِلصَّائِمِ فِیْہِ حَتّٰی یَدْخُلَ الْجَنَّةَ (٩)

''شعبان کو شعبان اس لیے کہتے ہیں کیونکہ اس مہینے میں روزہ رکھنے والے کے لیے مختلف قسم کی بہت ساری بھلائیاں جمع ہوتی رہتی ہیں یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔''

٢) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

شَعْبَانُ شَھْرِیْ وَرَمَضَانُ شَھْرُ اللّٰہِ (١٠)

''شعبان میرا مہینہ ہے اور رمضان اللہ کا مہینہ ہے''۔

شب برات کی فضیلت میں صحیح روایت

١) وَعَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: ((یَطَّلِعُ اللّٰہُ اِلٰی جَمِیْعِ خَلْقِہٖ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَیَغْفِرُ لِجَمِیْعِ خَلْقِہٖ اِلَّا لِمُشْرِکٍ اَوْ لِشَاحِنٍ)) (١١)

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو اپنی تمام مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پس اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کو بخش دیتے ہیں سوائے مشرک اور کینہ پرور کے۔''

شب برات کی فضیلت میں حسن روایت

١) حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((اِذَا کَانَ لَیْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ اِطَّلَعَ اللّٰہُ اِلٰی خَلْقِہٖ فَیَغْفِرُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ وَیُمْلِیْ لِلْکَافِرِیْنَ وَیَدَعُ اَھْلَ الْحِقْدِ بِحِقْدِھِمْ حَتّٰی یَدَعُوْہُ)) (١٢)

''جب نصف شعبان کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پس تمام مخلوق کو بخش دیتے ہیں اور کافروں کو ڈھیل دیتے ہیں اور بغض رکھنے والوں کو ان کے بغض کے ساتھ چھوڑ دیتے ہیں یہاں تک کہ وہ اس کو ترک کر دیں۔'' (یعنی جب تک وہ بغض اور کینہ ختم نہ کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت نہیں فرمائے گا)۔

شب برات کی فضیلت میں ضعیف روایات

۱) حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((اِذَا کَانَ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ نَادٰی مُنَادٍ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهٗ؟ هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَأُعْطِیَهٗ؟ فَلَا یَسْاَلُ اَحَدٌ شَیْئًا اِلَّا اُعْطِیَ اِلَّا زَانِیَةٌ بِفَرْجِهَا اَوْ مُشْرِكٌ)) (۱۳)

''جب نصف شعبان کی رات ہوتی ہے تو ایک پکار لگانے والا پکار لگاتا ہے کہ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخش دوں؟ ہے کوئی سوال کرنے والا کہ میں اس کو عطا کروں؟ پس نہیں کوئی سوال کرتا کسی چیز کے بارے میں مگر اس کو وہ چیز دے دی جاتی ہے سوائے اُس عورت کے جو اپنی شرم گاہ کے ساتھ زنا کرتی ہے اور مشرک کے''۔

۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((اِذَا کَانَ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ یَغْفِرُ اللّٰهُ مِنَ الذُّنُوْبِ اَکْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ کَلْبٍ)) (۱۴)

''جب نصف شعبان کی رات ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ ''کلب'' قبیلے کی بکریوں سے زیادہ گناہوں کو معاف کرتے ہیں۔''

۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ یَطَّلِعُ عَلٰی عِبَادِهٖ فِیْ لَیْلَةِ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَیَغْفِرُ لِلْمُسْتَغْفِرِیْنَ وَیَرْحَمُ الْمُسْتَرْحِمِیْنَ وَیُؤَخِّرُ اَهْلَ الْحِقْدِ کَمَا هُمْ)) (۱۵)

''اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو اپنے بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، پس استغفار کرنے والوں کو بخش دیتے ہیں اور رحم طلب کرنے والوں پر رحم کرتے ہیں اور اہل بغض کو ان کی حالت پر چھوڑ دیتے ہیں۔''

۴) راشد بن سعد سے نصف شعبان کی رات کے بارے میں مرسلاً مروی ہے:

یُوْحِی اللّٰهُ اِلٰی مَلَكِ الْمَوْتِ یَقْبِضُ کُلَّ نَفْسٍ یُرِیْدُ قَبْضَهَا فِیْ تِلْكَ السَّنَةِ (۱۶)

''اللہ تعالیٰ (اس رات میں) ملک الموت کی طرف وحی کرتے ہیں کہ وہ ہر اُس جان کو قبض کر لے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس سال میں قبض کرنے کا ارادہ کیا ہے''۔

۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَیْلَةً فَخَرَجْتُ فَاِذَا هُوَ بِالْبَقِیْعِ فَقَالَ: ((اَکُنْتِ تَخَافِیْنَ اَنْ یَحِیْفَ اللّٰهُ عَلَیْكِ وَرَسُوْلُهٗ)) قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنَّكَ اَتَیْتَ بَعْضَ نِسَائِكَ فَقَالَ:
((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ یَنْزِلُ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا فَیَغْفِرُ لِاَکْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعْرِ غَنَمِ کَلْبٍ)) (۱۷)

''میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک رات گم پایا۔ میں (آپؐ کو تلاش کرنے کے لیے) نکلی تو آپؐ بقیع (مدینہ کا قبرستان) میں موجود تھے۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''اے عائشہ! کیا تجھے اس بات کا اندیشہ تھا کہ اللہ اور اس کا رسول تجھ سے ناانصافی کریں گے؟'' تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میرا گمان یہ تھا کہ آپ اپنی کسی دوسری بیوی کے پاس گئے ہوں گے۔ پس آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور بنوکلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی زیادہ (گناہوں) کی مغفرت فرماتا ہے۔''

۶) عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: یَطَّلِعُ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اِلٰی خَلْقِهٖ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَیَغْفِرُ لِعِبَادِهٖ اِلَّا اثْنَیْنِ مُشَاحِنٍ وَ قَاتِلِ نَفْسٍ (۱۸)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو اپنی مخلوق کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مغفرت فرماتے ہیں سوائے کینہ رکھنے والے اور کسی جان کو ناحق قتل کرنے والے کے۔''

۷) عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((هَلْ تَدْرِیْنَ مَا هٰذِهِ اللَّیْلُ؟ یَعْنِیْ لَیْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ)) قَالَتْ مَا فِیْهَا یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم؟ فَقَالَ: ((فِیْهَا اَنْ یُکْتَبَ کُلُّ مَوْلُوْدٍ مِنْ بَنِیْ آدَمَ فِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِیْهَا اَنْ یُکْتَبَ کُلُّ هَالِكٍ مِنْ بَنِیْ آدَمَ فِیْ هٰذِهِ السَّنَةِ وَفِیْهَا تُرْفَعُ أَعْمَالُهُمْ وَفِیْهَا تَنْزِلُ أَرْزَاقُهُمْ فَقَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی؟ فَقَالَ: ((مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ اِلَّا بِرَحْمَةِ اللّٰهِ تَعَالٰی)) ثَلَاثًا، قُلْتُ وَلَا أَنْتَ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ فَوَضَعَ یَدَهٗ عَلٰی هَامَّتِهٖ فَقَالَ: ((وَلَا أَنَا اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ)) یَقُوْلُهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ (۱۹)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''(اے عائشہ!) کیا تو جانتی ہے یہ کون سی رات ہے؟ یعنی نصف شعبان کی رات۔'' حضرت عائشہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس رات میں کیا ہوتا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''اس رات اس سال پیدا ہونے والے اور مرنے والے ہر ابن آدم کا نام لکھا جاتا ہے۔ اس رات میں اعمال بلند کیے جاتے ہیں اور اس رات میں لوگوں کا رزق نازل کیا جاتا ہے''۔ پس حضرت عائشہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا کوئی بھی اللہ کی رحمت کے بغیر جنت میں داخل نہ ہوگا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''کوئی بھی جنت میں اللہ کی رحمت کے بغیر داخل نہیں ہوگا۔'' آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ فرمائی تو حضرت عائشہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ بھی؟ آپؐ نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے ہوئے فرمایا: ''ہاں میں بھی، سوائے اس کے کہ مجھے اللہ کی رحمت ڈھانپ لے۔'' آپؐ نے تین مرتبہ یہ کلمات کہے۔''

۸) عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((أَتَانِیْ جِبْرَئِیْلُ فَقَالَ هٰذِهٖ لَیْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَلِلّٰهِ فِیْهَا عُتَقَاءُ مِنَ النَّارِ بِعَدَدِ شُعُوْرِ غَنَمِ بَنِیْ کَلْبٍ وَلَا یَنْظُرُ اللّٰهُ فِیْهَا اِلٰی مُشْرِكٍ وَلَا اِلٰی شَاحِنٍ وَلَا اِلٰی قَاطِعِ رَحِمٍ وَلَا اِلٰی مُسْبِلٍ وَلَا اِلٰی عَاقٍّ لِوَالِدَیْهِ وَلَا اِلٰی مُدْمِنِ خَمْرٍ)) (۲۰)

’’حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’میرے پاس حضرت جبرئیلؑ آئے اور کہا کہ یہ نصف شعبان کی رات ہے اور اللہ تعالیٰ اس رات بنوکلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ لوگوں کو آگ سے آزاد کرتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ اس رات مشرک اور کینہ پرور کی طرف نظر کرم نہیں فرماتا اور نہ ہی قطع رحمی کرنے والے کی طرف اور نہ ہی اپنا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکانے والے کی طرف اور نہ ہی والدین کے نافرمان کی طرف اور نہ ہی ہمیشہ شراب نوشی کرنے والے کی طرف۔‘‘

شب برات کی فضیلت میں موضوع روایات

۱) حضرت علیؓ سے مروی ہے:

إِذَا كَانَ لَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ فَقُومُوا لَيْلَتَهَا وَصُومُوا يَوْمَهَا فَإِنَّ اللّٰهَ يَنْزِلُ فِيهَا بِغُرُوبِ الشَّمْسِ إِلٰى سَمَاءِ الدُّنْيَا فَيَقُولُ أَلَا مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ؟ أَلَا مِنْ مُسْتَرْزِقٍ فَأَرْزُقَهُ؟ أَلَا مُبْتَلًى فَأُعَافِيَهُ؟ أَلَا سَائِلٍ فَأُعْطِيَهُ؟ أَلَا كَذَا وَكَذَا؟ حَتّٰى يَطْلَعَ الْفَجْرُ (۲۱)

’’جب نصف شعبان کی رات ہو تو اس رات کو قیام کرو اور دن کو روزہ رکھو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اس رات میں غروبِ آفتاب کے وقت آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ طلوعِ فجر تک یہ آواز لگاتے رہتے ہیں کہ ہے کوئی بخشش طلب کرنے والا کہ میں اس کو بخش دوں؟ ہے کوئی رزق طلب کرنے والا کہ میں اس کو رزق دوں؟ ہے کوئی آزمائش والا کہ میں اس کی آزمائش دُور کر دوں؟ ہے کوئی سوال کرنے والا کہ میں اس کو عطا کروں؟ کیا ایسا ایسا کوئی نہیں ہے؟‘‘

۲) حضرت ابوامامہؓ سے مروی ہے:

خَمْسُ لَيَالٍ لَا تُرَدُّ فِيهِنَّ دَعْوَةٌ: أَوَّلُ لَيْلَةٍ مِنْ رَجَبٍ وَلَيْلَةُ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ وَلَيْلَةُ الْجُمُعَةِ وَلَيْلَةُ الْفِطْرِ وَلَيْلَةُ النَّحْرِ (۲۲)

’’پانچ راتیں ایسی ہیں کہ ان میں کوئی دعا رد نہیں ہوتی: رجب کے مہینے کی پہلی رات' نصف شعبان کی رات' جمعہ کی رات' عیدالفطر کی رات اور عیدالاضحیٰ کی رات۔‘‘

۳) قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ صَلّٰى فِي هٰذِهِ اللَّيْلَةِ مِائَةَ رَكْعَةٍ أَرْسَلَ اللّٰهُ إِلَيْهِ مِائَةَ مَلَكٍ ثَلَاثُونَ يُبَشِّرُونَهُ بِالْجَنَّةِ وَثَلَاثُونَ يُؤْمِنُونَهُ عَنْ عَذَابِ النَّارِ وَثَلَاثُونَ يَدْفَعُونَ عَنْهُ آفَاتِ الدُّنْيَا وَعَشَرَةٌ يَدْفَعُونَ عَنْهُ مَكَائِدَ الشَّيْطَانِ (۲۳)

’’اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’جو شخص بھی اس رات سو رکعات ادا کرے گا اللہ تعالیٰ اُس کی طرف سو فرشتوں کو بھیجے گا' تیس فرشتے اس کو جنت کی خوشخبری دیں گے' تیس اس کو آگ کے عذاب سے امن دیں گے' تیس اس سے دنیا کی آفات کو دُور کریں گے اور دس اس سے شیطان کی چالوں کو دور کریں گے۔‘‘

۴) مَنْ صَلّٰى لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً يَقْرَأُ فِي كُلِّ رَكْعَةٍ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ثَلَاثِينَ مَرَّةً لَمْ يَمُتْ حَتّٰى يَرٰى مَقْعَدَهُ مِنَ الْجَنَّةِ (۲۴)

’’جس نے نصف شعبان کی رات کو بارہ رکعات ادا کیں اور ہر رکعت میں 'قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ' تیس مرتبہ پڑھی تو وہ اپنے مرنے سے پہلے جنت میں اپنا مقام دیکھ لے گا اور گھر کے ان دس افراد کی شفاعت کرے گا جن کے لیے آگ واجب ہو چکی ہو۔‘‘

۵) مَنْ أَصْبَحَ فِي ذٰلِكَ الْيَوْمِ صَائِمًا كَانَ كَصِيَامِ سِتِّينَ سَنَةً مَاضِيَةً وَسِتِّينَ سَنَةً مُقْبِلَةً (۲۵)

’’جس نے اس دن روزہ رکھا اسے ساٹھ سال ماضی کا اور ساٹھ سال مستقبل کا روزہ رکھنے کا ثواب ہوگا۔‘‘

شب برات کی بدعات

ہمارے معاشرے میں شب برات کے حوالے سے درج ذیل بدعات پائی جاتی ہیں جن کی نقل و عقل میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

چراغاں کرنا اور پٹاخے چھوڑنا

یہ بری رسم سوائے پاکستان کے دیگر اسلامی ممالک میں نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ رسم ہندوؤں سے وراثت میں ملی ہے۔ آتش بازی ہندوؤں کی رسم دیوالی کی نقل ہے۔ علاوہ ازیں اس میں آتش پرست مجوسیوں سے بھی مشابہت ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ)) (۲۶)

’’جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے (یعنی اس کا مجھ سے اور دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے)۔‘‘

ایک تو اس رسم میں ہندوؤں اور مجوسیوں کی مشابہت ہے دوسرا اس میں اسراف اور تبذیر ہے۔ لاکھوں روپے آگ کی نذر ہو جاتے ہیں' حالانکہ اسی رقم کو معاشرے کے غرباء اور مساکین کی فلاح و بہبود میں لگایا جا سکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيٰطِينِ ط﴾ (الاسراء:۲۷)

’’بے شک فضول خرچ شیاطین کے بھائی ہیں۔‘‘

آتش بازی کی سب سے بڑی قباحت جو آئے دن دیکھنے میں آتی ہے‘ وہ انسانی جانوں کا ضیاع ہے۔ قومی روزناموں میں یہ خبر شائع ہو چکی ہے کہ لاہور سے تعلق رکھنے والے ایک فرد کی شادی میں پورا خاندان بس میں موجود پٹاخوں کے آگ پکڑنے کی وجہ سے جل کر راکھ ہو گیا۔ لہٰذا آتش بازی چاہے شب برات پر ہو یا دوسرے مواقع پر‘ ایک شیطانی فعل ہے اور ممنوع ہے۔

شب برات کا حلوہ

حلوہ پکانا اور کھانا ایک مباح امر ہے۔ سال بھر میں کسی بھی دن‘ کسی بھی وقت میں پکایا اور کھایا جا سکتا ہے‘ لیکن شب برات میں اس عقیدے کے ساتھ حلوہ تیار کرنا کہ یہ ہمارے مُردوں کی عید ہے اور ان کی ارواح اس دن اپنے گھروں کو واپس لوٹتی ہیں‘ ایک مَن گھڑت عقیدہ وعمل ہے جس کا قرآن وسنت سے کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس عمل کے ابطال کے لیے اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ہمارے رسول ﷺ کی زندگی میں تقریباً ۲۳ دفعہ شب برات آئی‘ لیکن کیا آپ نے زندگی میں ایک دفعہ بھی حلوہ پوری یا چاول پکوا کر مُردوں کی فاتحہ دلوائی؟ دراصل یہ رسم بھی ہمارے ہاں ہندوؤں سے آئی ہے۔ ہندو بھی سال بھر میں ایک دفعہ حلوا پکا کر کوؤں کو کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم یہ حلوہ اپنے پرکھوں کو کھلاتے ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ کہ حلوہ بنانے اور کھانے میں کوئی قباحت نہیں ہے‘ لیکن ایک مخصوص دن میں ایک خاص عقیدے کے تحت مُردوں کو ایصالِ ثواب کی نیت سے حلوہ‘ کھیر یا چاول وغیرہ تیار کرنا ایک ہندوانہ رسم ہے جس کا کوئی ثبوت رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے نہیں ملتا۔

قبرستان کی زیارت

قبرستان کی زیارت کرنا مشروع ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم بھی فرمایا۔ آپؐ کی حدیث ہے:

((كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ ...... فَزُوْرُوْهَا فَاِنَّهَا تُذَكِّرُ الْآخِرَةَ)) (۲۷)

’’میں نے پہلے تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا...... پس اب تم ان کی زیارت کیا کرو‘ کیونکہ قبروں کی زیارت آخرت کی یاد دلاتی ہے‘‘۔

لیکن پندرہ شعبان کی رات کو جلوس کی شکل بنا کر چراغاں کرتے ہوئے قبرستان کے لیے نکلنا اور اسے سنت سمجھنا بالکل غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی کسی بھی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ آپؐ پندرہ شعبان کی رات کو قبرستان کے لیے نکلے ہوں۔ اس کے لیے عموماً جو احادیث بیان کی جاتی ہیں وہ ضعیف روایات ہیں۔ لہٰذا قبرستان جانا تو سنت ہے‘ لیکن خصوصاً پندرہ شعبان کی رات کو جانا سنت نہیں ہے۔

شب برات کی مخصوص عبادات

نصف شعبان کی رات کی فضیلت تو صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اس رات کی فضیلت کا اعتبار کرتے ہوئے اس رات عمومی عبادات مثلاً نوافل‘ تلاوت اور انفرادی ذکر واذکار وغیرہ کا اہتمام کیا جا سکتا ہے‘ لیکن اس رات کی کوئی مخصوص عبادت مثلاً بارہ رکعتیں پڑھنا اور ہر رکعت میں تیس دفعہ ’’قُلْ هُوَ اللّٰهُ‘‘ پڑھنا کسی بھی صحیح یا حسن روایت سے ثابت نہیں ہے‘ بلکہ اس رات کی مخصوص عبادات کے حوالے سے جتنی روایات مروی ہیں وہ موضوعات کے درجے کی ہیں جن کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے اور موضوع روایات کا بیان کرنا بھی حرام ہے‘ چہ جائیکہ ان پر عمل کیا جائے۔

پندرہ شعبان کا روزہ

شعبان کے مہینے میں روزہ رکھنا اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے‘ لیکن آپؐ نے اپنی اُمت کو پندرہ شعبان کے بعد روزہ رکھنے سے منع فرما دیا‘ تاکہ رمضان کے روزوں میں سستی پیدا نہ ہو۔ اس لیے شعبان کے مہینے کی عمومی فضیلت کے تحت یا ایامِ بیض میں روزہ رکھنے والی صحیح احادیث سے استدلال کرتے ہوئے اس دن روزہ رکھا جا سکتا ہے۔ حضرت قتادہ بن ملحان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُنَا اَنْ نَصُوْمَ الْبِيْضَ ثَلَاثَ عَشْرَةَ وَاَرْبَعَ عَشْرَةَ وَخَمْسَ عَشْرَةَ (۲۸)

’’اللہ کے رسول ﷺ ہمیں ایامِ بیض یعنی ہر مہینے کی تیرہ‘ چودہ اور پندرہ تاریخ کو روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے‘‘۔

لیکن پندرہ شعبان کے روزے کی علیحدہ سے کوئی خصوصی فضیلت کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے۔ اس بارے میں جو روایات ہیں وہ موضوع ہیں‘ لہٰذا اگر کوئی شخص ایامِ بیض کے روزے ہر ماہ رکھتا ہے اور وہ پندرہ شعبان کا روزہ رکھ لے تو اس کے لیے باعث اجر وثواب ہوگا۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صوم شعبان۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب صیام النبی ﷺ فی غیر رمضان......الخ۔

(۳) سنن ابی داوٗد، کتاب الصوم، باب فی صوم شعبان۔

(٤) جامع الترمذی، ابواب الصوم عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی کراھیة الصوم فی النصف الثانی من شعبان۔

(٥) صحیح الترغیب و الترھیب : ٦١٩۔ علامہ البانی۔

(٦) صحیح الجامع الصغیر: ٣٧١١، علامہ البانی۔

(٧) جامع الترمذی، ابواب الزکاۃ، باب ما جاء فی فضل الصدقة۔

(٨) ضعیف الجامع الصغیر: ٣٤١١، علامہ البانی۔

(٩) ضعیف الجامع الصغیر: ٢٠٦١، علامہ البانی۔

(١٠) ضعیف الجامع الصغیر: ٣٤٠٢، علامہ البانی۔

(١١) صحیح الترغیب و الترھیب: ٢٧٦٧، علامہ البانی۔

(١٢) صحیح الجامع الصغیر: ٧٧١، علامہ البانی۔

(١٣) ضعیف الجامع الصغیر: ٦٥٣، علامہ البانی۔

(١٤) ضعیف الجامع الصغیر: ٦٥٤، علامہ البانی۔

(١٥) ضعیف الجامع الصغیر: ١٧٣٩، علامہ البانی۔

(١٦) ضعیف الجامع الصغیر: ٤٠١٩، علامہ البانی۔

(١٧) جامع الترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی لیلة النصف من شعبان۔

(١٨) مسند احمد۔ و تحفة الاحوذی شرح جامع الترمذی، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری، کتاب الصوم، باب ما جاء فی لیلة النصف من شعبان۔

(١٩) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الصلاۃ، باب قیام شھر رمضان، فصل ثالث۔

(٢٠) ضعیف الترغیب و الترھیب: ٦٢٠، علامہ البانی۔

(٢١) سنن ابن ماجہ، کتاب اقامة الصلاۃ و السنة فیھا، باب ما جاء فی لیلة النصف من شعبان۔ وضعیف الجامع الصغیر: ٦٥٢، علامہ البانی۔

(٢٢) ضعیف الجامع الصغیر: ٢٨٥٢، علامہ البانی۔

(٢٣) الموضوعات، علامہ ابن جوزی، کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ اللیلة النصف من شعبان۔

(٢٤) اللآلی المصنوعة، علامہ سیوطی، کتاب الصلاۃ۔

(٢٥) تحفة الاحوذی، شرح جامع الترمذی، علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری، کتاب الصوم، باب ما جاء فی لیلة النصف من شعبان۔

(٢٦) سنن ابی داوٗد، کتاب اللباس، باب فی لبس الشھرة۔ و مسند احمد۔

(٢٧) سنن الترمذی، ابواب الجنائز عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء فی الرخصة فی زیارۃ القبور۔

(٢٨) سنن ابی داوٗد، کتاب الصوم، باب فی صوم الثلاث من کل شھر۔

تحویلِ قبلہ

بنتِ زاہد

قبلہ کی حقیقت اور مختصر تاریخ

قبلہ کے لفظی معنی ہیں سمت‘ توجہ‘ یعنی جس طرف رُخ کیا جائے۔ مؤمن کا رُخ ہر عبادت میں صرف ایک وحدہٗ لاشریک ذات کی طرف ہوتا ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ پاک مشرق ومغرب اور شمال وجنوب کی قیدوں اور سمتوں سے بالاتر ہے۔ وہ کسی خاص سمت میں نہیں۔ اس کا اثر طبعی طور پر یہ ہونا تھا کہ کوئی عبادت کرنے والا کسی خاص رُخ کا پابند نہ ہوتا‘ جس کا جس طرف جی چاہتا نماز میں اپنا رُخ اُسی طرف کر لیتا۔ ایک ہی آدمی کسی وقت ایک طرف اور کسی وقت دوسری طرف رُخ کرتا تو وہ بھی بے جا نہ ہوتا۔ لیکن حکمتِ الٰہیہ اس بات کی متقاضی ہوئی کہ تمام عبادت گزاروں کا رُخ ایک ہی طرف ہونا چاہیے۔ عبادات کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض انفرادی ہیں اور بعض اجتماعی ہیں۔ انفرادی عبادت مثلاً روزہ وغیرہ کو خلوت میں اور اخفاء کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے‘ جبکہ حج اور نماز اجتماعی عبادات ہیں جن کو جماعت‘ اجتماع اور اعلان کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے‘ تاکہ عبادت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اجتماعی زندگی کے آداب بھی سکھائے جا سکیں۔ اور یہ بھی بالکل ظاہر ہے کہ اجتماعی نظام کا سب سے بڑا اور بنیادی اصول افرادِ کثیرہ کی وحدت اور یکجہتی ہے۔ یہ وحدت جتنی قوی ہوگی اجتماعی نظام اتنا ہی مستحکم ہوگا۔

دینِ اسلام نے وحدت کا اصل نقطہ عقیدہ کی وحدت کو قرار دیا اور کروڑوں خداؤں کی پرستش میں بٹی ہوئی دنیا کو ایک ذاتِ حق وحدہ لاشریک کی عبادت اور اطاعت کی دعوت دی۔ شریعتِ اسلامی میں مرکزِ وحدت ایسی چیزوں کو بنایا گیا جو اختیاری بھی ہوں اور آسان بھی‘ جیسے جماعتِ نماز کی صف بندی‘ ایک امام کی نقل وحرکت کی مکمل پابندی‘ حج میں لباس اور مسکن کا اشتراک وغیرہ‘ اسی طرح سے سمتِ قبلہ کی وحدت۔ نماز میں اجتماعی صورت اور

_2008\meesaq september\ms09-08 tahveel-e-qibla.inp 8/20/2014 5:04 PM PAGE 1 (1,1)

وحدت پیدا کرنے کے لیے تمام دنیا کے انسانوں کا رُخ کسی ایک ہی سمت و جہت ہونا بہترین وحدت کا ذریعہ ہے۔ اب وہ سمت و جہت کون سی ہو‘ اس کا تعین خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا میں اتارنے سے پیشتر فرشتوں کے ذریعے بیت اللہ کی بنیاد رکھ دی گئی تھی۔ حضرت آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کا سب سے پہلا قبلہ بیت اللہ اور خانۂ کعبہ ہی بنایا گیا:

﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ ہُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ﴿ۚ۹۶﴾﴾

(آل عمران)

’’یقیناً سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا‘ وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے‘ وہ برکت والا اور ہدایت والا ہے جہان والوں کے لیے‘‘۔

حضرت نوح علیہ السلام تک سب کا قبلہ یہی بیت اللہ تھا۔ طوفانِ نوح کے وقت پوری دنیا غرق ہو کر تباہ ہو گئی۔ بیت اللہ کی عمارت بھی منہدم ہو گئی اور اس کے بعد دوبارہ بحکمِ خداوندی حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی اور یہی اُن کا اور اُن کی اُمت کا قبلہ رہا‘ جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

﴿وَ اِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَ اِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور (یاد کرو) جب ابراہیمؑ خانہ کعبہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اسمٰعیلؑ بھی (تو دعا کر رہے تھے) اے ہمارے پروردگار! ہم سے (یہ خدمت) قبول فرمالے! یقیناً تو خوب سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

اس کے بعد انبیاءِ بنی اسرائیل کے لیے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا جسے حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ اس کی شہادت خود بائبل سے ملتی ہے۔ بیت المقدس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ۴۵۰ سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا۔ (۱۔سلاطین‘ باب ۶‘ آیت ۱) اور یہ اہلِ توحید کا قبلہ قرار پایا۔ (۱۔سلاطین‘ باب ۸‘ آیات ۲۹‘ ۳۰)[(۱)] اور بقول ابوالعالیہ انبیاء سابقہ علیہم السلام جو بیت المقدس میں نماز پڑھتے تھے‘ وہ بھی عملاً ایسا کرتے تھے کہ صخرۂ بیت المقدس بھی سامنے رہے اور بیت اللہ بھی۔ (ذکرہ القرطبی)

کعبہ کے قبلۂ نماز ہونے کی ابتدا کب ہوئی؟

اس میں صحابہ و تابعین کا اختلاف ہے کہ ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں جب نماز فرض

(۱) یہ عبارت اسلامی انسائیکلوپیڈیا از سید قاسم محمود سے لی گئی ہے۔

m

ہوئی تو اُس وقت قبلہ بیت اللہ تھا یا بیت المقدس۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول یہ ہے کہ اوّل ہی سے قبلہ بیت المقدس تھا' جو ہجرت کے بعد بھی سولہ سترہ مہینے رہا' اس کے بعد بیت اللہ کو قبلہ بنانے کے احکام نازل ہو گئے' البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مکے میں یہ رہا کہ آپؐ حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے درمیان نماز پڑھتے تھے تاکہ بیت اللہ بھی سامنے رہے اور بیت المقدس کا استقبال بھی ہو جائے۔ مدینہ پہنچنے کے بعد یہ ممکن نہ رہا اور تحویل قبلہ کا اشتیاق ہوا۔ (ابن کثیر)

اور دوسرے حضرات نے فرمایا کہ جب نماز فرض ہوئی تو مکہ مکرمہ میں تو مسلمانوں کا ابتدائی قبلہ بیت اللہ ہی تھا' کیونکہ حضرات ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ بھی بیت اللہ ہی رہا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ میں رہے بیت اللہ ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ پھر ہجرت کے بعد آپؐ کا قبلہ بیت المقدس قرار دے دیا گیا اور مدینہ منورہ میں سولہ سترہ ماہ آپؐ نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی۔ اس کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے قبلے یعنی بیت اللہ کی طرف نماز میں توجہ کرنے کا حکم آ گیا۔ تفسیر قرطبی میں بحوالہ ابوعمرو اسی کو اصح القولین قرار دیا گیا ہے اور اس کی حکمت یہ بیان کی جاتی ہے کہ مدینہ منورہ میں تشریف لانے کے بعد چونکہ قبائلِ یہود سے سابقہ پڑا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مانوس کرنے کے لیے ان ہی کا قبلہ باذنِ خداوندی اختیار کر لیا' مگر پھر تجربہ سے ثابت ہوا کہ یہ لوگ اپنی ہٹ دھرمی سے باز آنے والے نہیں تو پھر آپؐ کو اپنے اصلی قبلے یعنی بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم مل گیا جو آپؐ کو اپنے آباء حضراتِ ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کا قبلہ ہونے کی وجہ سے طبعاً محبوب تھا۔

جن حضرات نے پہلا قول اختیار کیا ہے ان کے نزدیک حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں تو مشرکین سے امتیاز اور اُن سے مخالفت کا اظہار کرنا تھا' اس لیے ان کا قبلہ چھوڑ کر بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا' پھر ہجرت کے کچھ عرصہ بعد مدینہ طیبہ میں یہود و نصاریٰ سے امتیاز اور ان کی مخالفت کا اظہار مقصود ہوا تو ان کا قبلہ بدل کر بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔

صحیح بخاری کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سولہ سترہ مہینے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز ادا فرمائی (قرطبی)۔ حکمِ خداوندی کی تعمیل کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سراپا اطاعت تھے لیکن آپؐ کی طبعی رغبت اور دلی خواہش یہ تھی کہ آپؐ کا قبلہ وہی حضراتِ آدم و ابراہیم علیہما السلام کا قبلہ قرار دے دیا جائے' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم انتظارِ وحی میں بار بار آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھتے تھے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۚ فَوَلِّ

وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ (البقرۃ:۱۴۴)

’’(اے نبیؐ!) یہ آپ کے مُنہ کا آسمان کی طرف بار بار اُٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں۔ پس ہم لازماً اسی قبلے کی طرف آپ کو پھیر دیں گے جسے آپ پسند کرتے ہیں‘ پس مسجد حرام کی طرف اپنا رُخ پھیر دیجیے!‘‘

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی تمنا کا اظہار فرما کر اسے پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ آئندہ آپ مسجد حرام کی طرف رُخ کیا کریں۔

رسول اللہ ﷺ کے اشتیاقِ کعبہ کی مختلف وجوہ ہیں اور ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ آنحضرت ﷺ نزولِ وحی اور عطاءِ نبوت سے پہلے اپنی طبیعت وفطرت سے ملتِ ابراہیمی کے تابع کام کرتے تھے اور نزولِ وحی کے بعد قرآن نے بھی آپؐ کی شریعتِ مطہرہ کو ملتِ ابراہیمؑ کے مطابق قرار دیا۔ چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ بیت اللہ تھا اس لیے آپؐ کی دلی خواہش یہی تھی کہ آپؐ کا اور تمام مسلمانوں کا قبلہ بھی بیت اللہ قرار دیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ وجہ بھی تھی کہ قبائل عرب بھی چونکہ ملت ابراہیمی کو کم از کم زبان سے مانتے تھے اور اس کی پیروی کے مدعی تھے‘ کعبہ کے قبلۂ مسلمین ہو جانے سے ان کے اسلام کی طرف مائل ہو جانے کی توقع تھی اور سابقہ قبلۂ بیت المقدس میں جو موافقتِ اہل کتب کی توقع کی جا سکتی تھی سولہ سترہ ماہ کے عمل کے بعد وہ بھی منقطع ہو چکی تھی‘ کیونکہ یہودِ مدینہ منورہ میں اس کی وجہ سے اسلام سے کچھ قرب ہونے کے بجائے بُعد ہی بڑھا تھا۔

بہرحال رسول اللہ ﷺ کی خواہش یہی تھی کہ کعبہ کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دے دیا جائے۔ اور چونکہ مقربانِ بارگاہِ الٰہی انبیاء علیہم السلام اپنی کوئی خواہش اور درخواست حق تعالیٰ کی بارگاہ میں اُس وقت تک پیش نہیں کرتے جب تک ان کو اس کو پیش کرنے کی اجازت کا علم نہ ہو جائے اس لیے اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ آپؐ کو یہ دعا کرنے کی اجازت مل چکی تھی اور آپؐ اس کی دُعا کر رہے تھے اور اس کی قبولیت کے اُمیدوار تھے‘ اسی لیے بار بار آسمان کی طرف نظر مبارک اُٹھاتے تھے کہ شاید فرشتہ حکم لے کر آ جائے۔ آیت مذکورہ ﴿قَدۡ نَرٰی ...... الآیۃ﴾ میں اس کیفیت کا بیان فرما کر پہلے تو قبولیتِ دعا کا وعدہ فرمایا کہ ﴿فَلَنُوَلِّیَنَّکَ قِبۡلَۃً تَرۡضٰهَا﴾ اور اس کے فوراً بعد ہی رُخ پھیرنے کا حکم بھی فرما دیا کہ: ﴿فَوَلِّ وَجۡهَکَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ اس طرزِ عمل میں ایک خاص لطف یہ تھا کہ پہلے وعدہ کی خوشی حاصل ہو‘ پھر ایفائے عہد کی خوشی قند مکرر ہو جائے۔ (بحوالہ قرطبی‘ جصاص‘ مظہری)

یہاں ایک فقہی نکتہ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس آیت میں کعبہ یا بیت اللہ کے بجائے لفظ ''مسجد حرام'' کا استعمال فرمایا گیا ہے۔ یہ لفظ عام طور پر تو بیت اللہ کے گرد چار دیواری سے گھری ہوئی جگہ کے لیے بولا جاتا ہے' لیکن قرآن وحدیث میں بعض اوقات یہ لفظ پورے حرم مکہ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے جو کئی مربع میل کا رقبہ اور حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی قائم کردہ حدود سے گھرا ہوا ہے۔ جیسا کہ واقعۂ معراج میں ﴿مِنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ سے یہی معنی مراد لیے گئے ہیں' کیونکہ واقعۂ معراج معروف مسجد حرام کے اندر سے نہیں بلکہ حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان سے ہوا ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ عٰهَدۡتُّمۡ عِنۡدَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ (التوبۃ: ۷) میں مسجد حرام سے پورا حرم مراد ہے' کیونکہ جس واقعۂ صلح کا اس میں ذکر ہوا ہے وہ حدیبیہ کے مقام پر ہے جو حدودِ حرم سے باہر اس کے متصل واقع ہے۔ پھر ایک دوسری سہولت لفظ ''شَطۡرَ'' اختیار کر کے دی گئی' ورنہ اس سے مختصر لفظ ''اِلٰی'' تھا' اس کو چھوڑ کر ''شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ'' فرمایا گیا۔ شطر کا مفہوم (i) نصف شے (ii) سمتِ شے ہے۔ باتفاقِ مفسرین یہاں شَطۡر سے مراد سمت ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ بلادِ بعید کے رہنے والوں کے لیے عین بیت اللہ کے محاذات کے بجائے سمتِ بیت اللہ کی طرف رُخ کر لینا کافی ہے' جبکہ جو شخص بیت اللہ کو کسی قریبی پہاڑ سے سامنے دیکھ رہا ہو یا مسجد حرام میں موجود ہو' اس کے لیے خاص بیت اللہ کی طرف رُخ کرنا ضروری ہے۔ اگر بیت اللہ کی کوئی بھی چیز اُس کے چہرے کے محاذات میں نہ آئی تو اس کی نماز نہ ہوگی۔

ہجرتِ مدینہ کے سولہ سترہ ماہ بعد مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ کو بنایا گیا۔ اس پر یہود اور بعض مشرکین و منافقین یہ اعتراض کرنے لگے کہ ان کے دین کا کوئی ٹھکانہ نہیں' ان کا قبلہ روز بروز بدلتا رہتا ہے۔ قرآن کریم نے ان کا اعتراض پہلے ہی نقل فرما دیا کہ:

﴿سَیَقُوۡلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمۡ عَنۡ قِبۡلَتِهِمُ الَّتِیۡ کَانُوۡا عَلَیۡهَا ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۴۲)

''عنقریب بے وقوف لوگ کہیں گے انہیں (مسلمانوں کو) اُس قبلے سے کس چیز نے پھیر دیا جس پر یہ پہلے تھے؟''

مگر ساتھ ہی اُن کو جواب بھی دیا گیا کہ:

﴿قُلۡ لِّلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ؕ یَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۱۴۲﴾﴾

''(اے نبیؐ! اِن سے) فرما دیجیے کہ اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب۔ وہ جس کو

a_2008\meesaq september\ms09-08 tahveel-e-qibla.inp 8/20/2014 5:04 PM PAGE 3 (1,1)

چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ کی طرف''۔

اس میں استقبالِ قبلہ کی حقیقت کو واضح فرما دیا گیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی خصوصیت بجز اِس کے کوئی نہیں کہ حکم ربّانی نے ان کو امتیاز دے کر قبلہ بنا دیا۔ وہ چاہتا تو کسی تیسری' چوتھی چیز کو بھی قبلہ بنا سکتا تھا۔ پھر جس کو قبلہ بنایا گیا اس کی طرف رُخ کرنے میں جو فضیلت اور ثواب ہے اس کی روح حکمِ حق جل شانہ کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ میں فرمایا گیا:

﴿لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡهَكُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَالۡمَغۡرِبِ وَلٰكِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ......﴾

''اس میں کوئی نیکی (اور ثواب) نہیں کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف اپنے رُخ کرو' بلکہ نیکی تو اصل میں اس کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر......''

ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۱۵)

''پس تم (اللہ کے فرمان کے مطابق) جس طرف بھی رُخ کرو اللہ تعالیٰ اُسی طرف متوجہ ہے۔''

ان آیات نے قبلہ اور استقبالِ قبلہ کی حقیقت کو بھی واضح فرما دیا کہ اِن مقامات کی کوئی ذاتی خصوصیت نہیں' بلکہ ان میں فضیلت پیدا کرنے کا سبب ہی یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو قبلہ بنانے کے لیے اختیار کر لیا' اور ان کی طرف رُخ کرنے میں ثواب کی وجہ بھی صرف حکمِ ربّانی کی اطاعت ہے۔ اور شاید آنحضرت ﷺ کے لیے قبلہ میں تغیر و تبدل فرمانے کی یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور سے لوگوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قبلہ کوئی بت نہیں کہ جس کی پرستش کی جائے' بلکہ اصل چیز حکمِ خداوندی ہے۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم آ گیا تو اس کی تعمیل کی' پھر جب کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم آ گیا تو اسی کی طرف رُخ کرنا عبادت ہو گیا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں خود قرآن نے بھی اس حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے:

﴿وَمَا جَعَلۡنَا الۡقِبۡلَةَ الَّتِیۡ كُنۡتَ عَلَیۡهَاۤ اِلَّا لِنَعۡلَمَ مَنۡ یَّتَّبِعُ الرَّسُوۡلَ مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡهِ ؕ﴾

''اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر (اے نبیؐ) آپ پہلے تھے' مگر اس غرض سے کہ ہم دیکھیں (ظاہر کر دیں) کہ کون پیروی کرتا ہے رسول کی اور کون پھر جاتا ہے

اُلٹے پاؤں''۔

اس حقیقتِ قبلہ کے بیان سے ان بے وقوف مخالفین کا بھی پورا جواب ہو گیا جو قبلہ کے بارے میں تغییر و تحویل کو اصولِ اسلام کے منافی سمجھتے اور مسلمانوں کو طعنے دیتے تھے۔ آخر میں ارشاد فرمایا:

﴿ يَهۡدِيۡ مَنۡ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ۝۱۴۲ ﴾

''اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے سیدھی راہ کی طرف۔''

اس میں بتا دیا گیا ہے کہ سیدھی راہ یہی ہے کہ انسان حکمِ حق جل شانہ کے لیے کمربستہ اور منتظر رہے' جو حکم مل جائے اس پر بے چون و چرا عمل کرے اور یہ سیدھی راہ اللہ کے فضل سے مسلمانوں کو حاصل ہوئی۔

مسند احمد کی ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اہل کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ سب سے بڑا حسد تین چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ ہفتہ میں ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کرنے کا حکم ساری اُمتوں کو ملا تھا' یہود نے سنیچر کا دن اختیار کر لیا اور نصاریٰ نے اتوار کا' جبکہ حقیقت میں عنداللہ وہ جمعہ کا روز تھا' جو مسلمانوں کے انتخاب میں آیا۔ دوسرے وہ قبلہ جو تحویل کے بعد مسلمانوں کے لیے مقرر کیا گیا اور تیسرے امام کے پیچھے آمین کہنا''۔ یہ تینوں خصلتیں صرف مسلمانوں کو میسر ہوئیں اور اہل کتاب ان سے محروم ہیں۔

نوٹ: مشرقی ممالک ہندوستان و پاکستان وغیرہ کے لیے جانبِ مغرب مسجد حرام کی سمت ہے۔ لہٰذا مغرب کی جانب رُخ کر لینے سے استقبالِ قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اور چونکہ گرمی' سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں بھی اختلاف ہوتا رہتا ہے' اس لیے فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اس سمت کو سمتِ مغرب و قبلہ قرار دیا ہے جو موسم گرما و سرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے۔ اور قواعدِ ریاضی کے حساب سے مغربِ صیف اور مغربِ شتاء کے درمیان ۴۸ ڈگری تک سمتِ قبلہ قرار دی جائے گی' یعنی ۲۴ ڈگری تک بھی اگر نمازی دائیں یا بائیں مائل ہو جائے تو سمتِ قبلہ فوت نہ ہو گی۔ ریاضی کی قدیم اور مشہور کتاب شرح چغمنی' باب رابع' صفحہ ۶۶ میں مغربین کا فاصلہ یہی ۴۸ ڈگری قرار دیا گیا ہے۔

جواہر الفقہ میں فقہاء کا دوسرا قول ذکر کیا گیا ہے کہ ۴۵ درجے دائیں یا بائیں مائل ہونے سے سمتِ قبلہ فوت نہ ہو گی۔ ❁❁

قرآن کی اصطلاح میں
عالم کون ہے؟

عتیق الرحمٰن صدیقی

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ مَثَلَ الْعُلَمَاءِ فِی الْاَرْضِ کَمَثَلِ النُّجُوْمِ فِی السَّمَاءِ یُھْتَدٰی بِھَا فِی ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ، فَاِذَا انْطَمَسَتِ النُّجُوْمُ اَوْشَکَ اَنْ تَضِلَّ الْھُدَاۃُ)) (مسند احمد)

''روئے زمین پر اہل علم کی مثال ستاروں کی سی ہے جس سے بحر و بر کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے' اگر یہ ستارے روپوش ہو جائیں تو راستہ پانے والوں کے بھٹک جانے کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔''

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ: ''علم سیکھو' کیونکہ علم کا سیکھنا خشیتِ الٰہی کا ذریعہ ہے' اس کی جستجو عبادت ہے' اس پر غور و تبادلۂ خیال تسبیح ہے' اس کی تلاش کی کوشش جہاد ہے' نہ جاننے والوں کو اس کا سکھانا صدقہ ہے اور جو اِس کے لائق ہیں ان کے لیے علم کو کام میں لانا اللہ تعالیٰ سے تقرب کا سبب ہے۔'' (ابن عبدالبر)

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ''علماءِ اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) پر اُن کے ماں باپ سے بھی زیادہ رحم کرنے والے ہیں''۔ اُن سے دریافت کیا گیا: وہ کیسے؟ تو جواب دیا: ''اس لیے کہ ماں باپ تو انہیں دنیا کی آگ سے بچاتے ہیں اور علماء انہیں آخرت کی آگ سے بچاتے ہیں''۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا: انسان کن لوگوں کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ فرمایا: ''اہل علم کو''۔ دریافت کیا گیا: پھر بادشاہ کن کو قرار دیا جا سکتا ہے؟ فرمایا: ''اہل زہد و تقویٰ کو۔'' (احیائے علوم الدین)

eesaaq_2006\Ma_2006\meesaq september\ma17-07 quran ki istilah mian aalim.inp 8/20/2014 5:06 PM PAGE 1 (1,1)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں پہلے علم کا ذکر فرمایا' پھر ساتھ ہی عمل کا بھی۔ علم کا سب سے اہم حصہ اللہ کی معرفت اور اس کی توحید ہی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ)) (متفق علیہ)

''اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے اسے دین میں سمجھ عطا فرماتا ہے''۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط﴾ (فاطر:۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے اُس کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی ڈرتے ہیں۔''

اس آیۂ کریمہ کے ٹکڑے کی تشریح کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی فرماتے ہیں:

''یعنی اللہ تعالیٰ کی کما حقہٗ قدر اور اس سے ڈر تو اسی کے دل میں پیدا ہوگا جو کائنات اور الٰہی قانون کے اسرار و رموز پر غور وخوض کے نتیجے میں اس کی عظیم قدرت اور مخلوق پر حاصل اقتدار کو جانے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ معرفت اہل علم ہی کو حاصل ہوسکتی ہے اور یہی خوف نیک اعمال کرنے اور برے کاموں سے اجتناب پر اُبھارتا ہے۔''

(تعلیم کی اہمیت' مترجم ابومسعود ندوی)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اِس آیت کی وضاحت ذیل کے الفاظ میں کرتے ہیں:

''پس درحقیقت اس آیت میں علم سے مراد فلسفہ و سائنس اور تاریخ و ریاضی وغیرہ رسمی علوم نہیں' بلکہ صفاتِ الٰہی کا علم ہے' قطع نظر اِس سے کہ آدمی خواندہ ہو یا ناخواندہ۔ جو شخص خدا سے بے خوف ہے وہ علامۂ دہر بھی ہو تو اس علم کے لحاظ سے جاہلِ محض ہے۔ اور جو شخص خدا کی صفات کو جانتا ہے اور اس کی خشیت اپنے دل میں رکھتا ہے وہ اَن پڑھ بھی ہو تو ذی علم ہے۔

اِس سلسلہ میں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ اس آیت میں لفظ ''علماء'' سے وہ اصطلاحی علماء بھی مراد نہیں ہیں جو قرآن و حدیث اور فقہ و کلام کا علم رکھنے کی بنا پر علماءِ دین کہے جاتے ہیں۔ وہ اس آیت کے مصداق صرف اسی صورت میں ہوں گے جب کہ ان کے اندر خدا ترسی موجود ہو۔ یہی بات حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمائی ہے: ليسَ العلم عن كثرة الحديث ولكن العلم عن كثرة الخشية ''علم کثرتِ حدیث کی بنا پر نہیں ہے بلکہ خوفِ خدا کی کثرت کے لحاظ سے ہے''۔ عالم وہ ہے جو اللہ سے بے دیکھے ڈرے' جو کچھ اللہ کو پسند ہے اُس کی طرف وہ راغب ہو

اور جس چیز سے اللہ ناراض ہے اس سے وہ کوئی دلچسپی نہ رکھے۔'' (تفہیم القرآن)

صاحب ضیاء القرآن اس آیت کی شرح یوں بیان کرتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کی اعجاز آفرینیوں کا جتنی دقتِ نگاہ سے لوگ مطالعہ کریں گے حکمتِ ربّانی کے نئے نئے جلوے رونما ہوتے جائیں گے۔ انہیں اس تدبر اور مطالعہ سے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا ایسا علم نصیب ہوگا جو انہیں عین الیقین کی منزل تک پہنچائے گا اور وہاں سے حق الیقین کی منزل زیادہ دُور نہیں...... جہاں شک و شبہ کا غبار نہیں وہاں پہنچ کر انہیں ربّ ذوالجلال والاکرام کی معرفت نصیب ہوگی۔ پھر جس خشیت سے اُن کے دل معمور ہوں گے ہمارے لیے اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے۔ حکماء کے نزدیک علم کی حقیقت کیا ہے؟ مجاہد فرماتے ہیں: **اِنَّمَا الْعَالِمُ مَنْ خَشِیَ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ** ''عالم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ عزّوجل سے ڈرتا رہے''۔ ربیع بن انس فرماتے ہیں: **مَنْ لم یَخْش الله تعالیٰ لیس لعالم** ''جس کے دل میں اللہ کا خوف نہیں وہ عالم نہیں''۔ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک قول مروی ہے: ''اگر دل میں اللہ کا خوف پیدا ہو جائے تو انسان کے لیے اتنا علم ہی کافی ہے' اور اس سے بڑی جہالت اور کوئی نہیں کہ انسان خدا سے غرور کرنے لگے''۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشادِ گرامی ہے:

ان الفقیه حق الفقه من لم یقنط الناس من رحمة الله' ولم یرخص لهم فی معاصی الله تعالی ولم یومنهم من عذاب الله تعالی ولم یدع القرآن رغبته الی غیره

''فقیہہ اور عالم وہ ہے جو لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہ کرے' اور خدا کی نافرمانی پر انہیں جری نہ کرے' اور خدا کے عذاب سے انہیں بے خوف نہ کردے اور قرآن کے بغیر اسے کوئی چیز اپنی طرف راغب نہ کر سکے۔'' (قرطبی)

مولانا مفتی محمد شفیعؒ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''**اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهُ** ...... میں ان لوگوں کا ذکر ہے جن کو اللہ تعالیٰ کی خشیت حاصل ہے ......لفظ ''علماء'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی ذات و صفات کا کماحقہٗ علم رکھتے ہیں اور مخلوقاتِ عالم میں اس کے تصرفات پر اور اس کے احسانات و انعامات پر نظر رکھتے ہیں۔ صرف عربی زبان یا اس کے صرف و نحو اور فنونِ بلاغت جاننے والوں کو قرآن کی اصطلاح میں عالم نہیں کہا جاتا جب تک اس کو اللہ کی معرفت

meesaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms17-07 quran ki istilah mian aalim.inp 8/20/2014 5:06 PM PAGE 2 (1,1)

مذکورہ طریق پر حاصل نہ ہو۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا کہ اس آیت میں اشارہ پایا جاتا ہے کہ جس میں خشیت نہیں وہ عالم نہیں۔ (مظہری) البتہ خشیت کبھی صرف اعتقادی اور عقلی ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی بہ تکلف احکامِ شرعیہ کا پابند ہوتا ہے اور کبھی یہ خشیت حالی اور ملکۂ راسخہ کے درجہ میں ہو جاتی ہے جس میں اتباعِ شریعت ایک تقاضائے طبیعت بن جاتا ہے۔ خشیت کا پہلا درجہ مأمور بہ اور عالم کے لیے ضروری ہے، دوسرا درجہ افضل و اعلیٰ ہے ضروری نہیں۔''

(معارف القرآن، بحوالہ بیان القرآن)

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

''لفظ علماء یہاں اصطلاحی مفہوم میں نہیں، بلکہ اپنے حقیقی مفہوم میں ہے۔ جس طرح فرمایا ہے: ﴿اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّہُمۡ بِالۡغَیۡبِ﴾ ''تم بس انہی لوگوں کو ڈرا سکتے ہو جو غیب میں رہتے ہوئے اپنے ربّ سے ڈرنے والے ہیں''۔ اسی طرح یہاں فرمایا (مذکورہ آیت میں)۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو محض ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ محسوسات سے آگے نہ اُن کو کچھ نظر آتا ہے اور نہ اس سے آگے وہ کچھ دیکھنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کے اندر ظاہر سے باطن اور مجاز سے حقیقت تک پہنچنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو اپنے بطن و فرج کی مطلوبات سے زیادہ اہمیت اپنی عقل اور روح کے مطالبات کو دیتے ہیں۔ درحقیقت یہی لوگ ہیں جو انسانیت کے گل سرسبد اور علماء کے لقب کے اصل مستحق ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے بنتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کی دعوت ان کو اپیل کرتی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صحیح علم کا منبع درحقیقت اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ جس کو خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی وہ علم سے بالکل محروم ہے، اگرچہ وہ دنیا جہان کی کتابیں حفظ کر ڈالے۔ اس طرح یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جس کو خدا کی معرفت حاصل ہے اس کے اندر لازماً خدا کی خشیت بھی ہوگی۔ اگر کوئی شخص خدا کی خشیت سے محروم ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس کی معرفت سے بھی محروم ہے۔ یہی معرفت اور خشیت انسان کے تمام علوم و افکار میں حقیقی زندگی پیدا کرتی ہے، جس سے علوم و فنون دنیا کے لیے موجبِ خیر و برکت بنتے ہیں۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو انسان کی ساری ذہانت شیطان کی مقصد برآری میں صرف ہوتی ہے اور وہ بالآخر تباہی کا موجب بنتی ہے۔'' (تدبر قرآن)

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی معرکۃ الآراء تفسیر میں اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

''اللہ کا خوف انہی دلوں میں پیدا ہوسکتا ہے جنہوں نے کائنات کے اسرار وحقائق کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے علم وحکمت سے بہرہ اندوز ہیں''۔ (ترجمان القرآن)

مولانا محمد جوناگڑھی کے ترجمۂ قرآن میں، جس کے تفسیری حواشی صلاح الدین یوسف نے لکھے ہیں، اس آیت کی توضیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یعنی اللہ کی ان قدرتوں اور اس کے کمالِ صناعی کو وہی جان اور سمجھ سکتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں۔ اس علم سے مراد کتاب وسنت اور اسرارِ الٰہیہ کا علم ہے۔ اور جتنی انہیں ربّ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اتنا ہی وہ رب سے ڈرتے ہیں۔ گویا جن کے اندر خشیتِ الٰہی نہیں ہے سمجھ لو کہ علم صحیح سے بھی وہ محروم ہیں۔''

سفیان ثوریؒ کہتے ہیں:

''علماء کی تین قسمیں ہیں: عالم باللہ اور عالم بامر اللہ۔ یہ وہ ہے جو اللہ سے ڈرتا اور اس کے حدود وفرائض جانتا ہے۔ دوسرا صرف عالم باللہ جو اللہ سے تو ڈرتا ہے مگر اُس کے حدود وفرائض سے بے علم ہے۔ تیسرا صرف عالم بامر اللہ جو حدود وفرائض سے باخبر ہے لیکن خشیتِ الٰہی سے عاری ہے''۔ (ابن کثیر)

مسلمان کا طرزِ حیات (۵۲)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"مِنهاجُ المُسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب العبادات

گیارہواں باب (مسلسل)

⑥ رمضان کے مہینہ کی ابتدا

رمضان کے مہینے کی ابتدا کا ثبوت دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ شعبان کے پورے تیس دن گزر جائیں تو ان کے بعد آنے والا اکتیسواں دن یقیناً رمضان کا پہلا دن سمجھا جائے گا۔ دوم رمضان کا چاند نظر آنا' یعنی شعبان کے انتیس دن گزرنے کے بعد تیسویں رات کو چاند نظر آجائے تو رمضان کا مہینہ شروع ہوگیا اور روزہ رکھنا ضروری ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرة:۱۸۵)

''تم میں سے جو کوئی (رمضان کے) مہینہ میں موجود ہو وہ اس (مہینہ) کے روزے رکھے۔''

ارشادِ نبویؐ ہے:

((اِذَا رَاَیْتُمُ الْهِلَالَ فَصُوْمُوْا وَاِذَا رَاَیْتُمُوْهُ فَاَفْطِرُوْا فَاِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَصُوْمُوْا ثَلَاثِيْنَ يَوْمًا)) [48]

---

۴۸) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب وجوب صوم رمضان لرؤیة الهلال والفطر لرؤیة الهلال۔ اس باب کی ایک روایت میں یہ لفظ ہیں ''تو اندازہ کرلو''۔ اس باب کی ایک روایت میں یہ لفظ ہیں ''تیس کا اندازہ کرلو''۔

meesaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj41a.inp 8/20/2014 4:14 PM PAGE 1 (1,1)

’’جب تم چاند دیکھو تو روزے رکھو اور جب چاند دیکھو تو روزے رکھنا چھوڑ دو۔ پس اگر بادل ہو جائیں تو تیس دن کی گنتی پوری کر لو۔‘‘

چاند نظر آنے کے ثبوت میں ایک یا دو قابلِ اعتماد افراد کی شہادت کافی ہے‘ کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے رمضان کا چاند نظر آنے کے لیے ایک آدمی کی گواہی کو قبول فرمایا۔(۴۹) البتہ شوال کے چاند کے لیے دو قابلِ اعتماد افراد کی گواہی ضروری ہے‘ کیونکہ آنحضرت ﷺ نے روزے ختم کرنے کے لیے ایک قابلِ اعتماد آدمی کی گواہی کو کافی نہیں سمجھا۔(۵۰)

نوٹ : جو شخص رمضان کا چاند دیکھ لے اس پر روزہ رکھنا فرض ہو جاتا ہے‘ اگرچہ دوسرے لوگ اس کی گواہی قبول نہ کریں۔ اور جو شخص عید الفطر کا چاند دیکھ لے پھر اس کی گواہی قبول نہ کی جائے تو وہ روزہ نہ چھوڑے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلصَّوْمُ یَوْمَ تَصُوْمُوْنَ وَالْفِطْرُ یَوْمَ تُفْطِرُوْنَ وَالْاَضْحٰی یَوْمَ تُضَحُّوْنَ))(۵۱)

’’روزہ اُس دن ہوتا ہے جس دن تم روزہ رکھو‘ اور عید الفطر اُس دن ہے جس دن تم روزے رکھنا بند کرو‘ اور عید الاضحیٰ اُس دن ہے جس دن تم قربانی کرو۔‘‘

⑦ روزے کی شرطیں اور اصحابِ عذر کے روزے کا حکم

ا) روزے کی شرطیں

مسلمان مرد یا عورت پر روزہ واجب ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلَاثَۃٍ : عَنِ الْمَجْنُوْنِ الْمَغْلُوْبِ عَلٰی عَقْلِہٖ حَتّٰی یَفِیْقَ

---

۴۹) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصوم‘ باب فی شھادۃ الواحد علی رؤیۃ ھلال رمضان۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

۵۰) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصوم‘ باب شھادۃ رجلین علی رؤیۃ ھلال شوال (بالمعنی)۔ و دارقطنی۔

۵۱) جامع الترمذی‘ کتاب الصوم عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء الصوم یوم تصومون والفطر یوم تفطرون۔ (امام ترمذی نے اسے حسن فرمایا) و سنن ابن ماجہ‘ کتاب الصیام‘ باب ما جاء فی شھری العید۔ و سنن ابی داوٗد‘ کتاب الصوم‘ باب اذا اخطأ القوم الھلال۔ (اس روایت میں پہلا فقرہ نہیں ہے)۔

وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ)) [٥٢]

''تین افراد پر سے قلم اٹھالیا گیا ہے (ان پر کوئی ذمہ داری نہیں): مجنون سے جس کی عقل کام نہ کررہی ہو (قلم اٹھالیا گیا ہے) افاقہ ہونے تک' سوئے ہوئے شخص سے جاگنے تک اور بچے سے بالغ ہونے تک۔''

مسلمان عورت کے لیے ایک مزید شرط ہے' وہ یہ کہ وہ حیض و نفاس سے پاک ہو۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے عورت کے دین میں نقص کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا:

((اَلَیْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ)) [٥٣]

''کیا ایسا نہیں ہے کہ جب وہ ایامِ حیض میں ہوتی ہے تو نہ نماز پڑھتی ہے اور نہ روزہ رکھتی ہے؟''

ب) مسافر

جب مسلمان اتنا سفر کرے جس سے نماز میں قصر کرنا شروع ہوتا ہے' یعنی اڑتالیس میل [٥٤] کا سفر کرے تو اسے شرعاً روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے' لیکن جب وہ مقیم ہو جائے گا تو اسے چھوڑے ہوئے روزے کی قضا کرنا لازم ہوگا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط﴾ (البقرۃ:١٨٥)

''اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں سے گنتی (پوری کرے)''۔

سفر کے دوران اگر روزہ رکھنے میں مشقت نہ ہو تو روزہ رکھ لینا بہتر ہے' اور اگر مشقت ہو تو روزہ چھوڑنا بہتر ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ رَمَضَانَ فَمِنَّا الصَّائِمُ وَمِنَّا الْمُفْطِرُ فَلَا

---

٥٢) مسند احمد۔ و سنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب فی المجنون یسرق او یصیب حدا۔ (یہ حدیث صحیح ہے)۔

٥٣) صحیح البخاری' کتاب الحیض' باب ترک الحائض الصوم۔

٥٤) نماز کی قصر کے حکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت میں "اربعة بُرد" (چار بُرد) کا لفظ ہے۔ ایک برید بارہ میل کا ہوتا ہے لہٰذا چار بُرد کی مسافت کی مقدار اڑتالیس میل ہوئی۔ (اس روایت کو دارقطنی نے ضعیف سند سے روایت کیا ہے کہ یہ موقوف روایت ہے۔ ابن خزیمہ نے بھی اسی طرح روایت کیا ہے۔) دیکھئے بلوغ المرام مترجم' ج ١' ص ٢٩٨۔

meesaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj4la.inp 8/20/2014 4:16 PM PAGE 2 (1,1)

يَجِدُ الصَّائِمُ عَلَى الْمُفْطِرِ وَلَا الْمُفْطِرُ عَلَى الصَّائِمِ(٥٥)

''ہم رمضان میں جناب رسول اللہﷺ کے ساتھ غزوہ میں شریک تھے تو ہم میں سے کوئی روزے سے تھا اور کوئی روزہ چھوڑے ہوئے تھا۔ (لیکن) نہ تو روزہ رکھنے والا چھوڑنے والے سے ناراض ہوتا تھا اور نہ روزہ چھوڑنے والا رکھنے والے پر ناراض ہوتا تھا''۔

یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ رائے تھی کہ اگر کسی میں طاقت ہو اور وہ روزہ رکھ لے تو اچھی بات ہے' اور اگر کوئی کمزوری محسوس کرے اور روزہ چھوڑ دے تو یہ بھی اچھی بات ہے۔

ج) مریض

جب کوئی مسلمان رمضان کے مہینے میں بیمار ہو جائے تو اپنی حالت پر غور کرے۔ اگر اسے روزہ رکھنے میں شدید مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تو روزہ رکھے' لیکن اگر روزہ رکھنے میں دشواری ہو تو روزہ نہ رکھے۔ پھر اگر اسے بیماری سے صحت یاب ہو جانے کی امید ہو تو انتظار کرے اور صحت یاب ہونے پر چھوٹے ہوئے روزے رکھ لے اور اگر صحت یابی کی امید نہ ہو تو روزے نہ رکھے' بلکہ ہر روزے کے بدلے ایک مُد (٥٦) خوراک یعنی دونوں ہاتھوں کی لپ بھر گندم بطور صدقہ ادا کرے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ﴾ (البقرة:١٨٤)

''اور جو لوگ طاقت نہیں رکھتے ان کے ذمے ایک مسکین کا کھانا فدیہ کے طور پر ادا کرنا ضروری ہے۔''

د) انتہائی بوڑھا شخص

اگر کوئی مسلمان مرد یا عورت شدید بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے کہ روزہ رکھنے کی طاقت نہ رہے تو روزے چھوڑ دے اور ہر چھوڑے ہوئے روزے کے بدلے ایک مُد کھانا صدقہ کرے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

رخص للشيخ الكبير ان يطعم عن كل يوم مسكينا ولا قضاء عليه(٥٧)

---

٥٥) صحيح مسلم' كتاب الصيام' باب جواز الصوم والفطر فی شهر رمضان للمسافر فی غير معصية۔

٥٦) مُد چوتھائی صاع کے برابر ہوتا ہے جس کا اندازہ دو تہائی سیر کیا گیا ہے' یعنی دس چھٹانک تین تولے چار ماشے۔

٥٧) سنن دارقطنی۔ ومستدرك حاكم' كتاب الصوم' ج ١' ص ٤٤٠۔ امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔

''انتہائی بوڑھے کے لیے رخصت ہے کہ ہر دن کے عوض ایک مسکین کو کھانا کھلائے اور اس کے ذمہ (روزے کی) قضا نہیں ہے۔''

۶) حاملہ اور دودھ پلانے والی

اگر مسلمان خاتون امید سے ہو اور اسے ڈر ہو کہ روزہ رکھنے کی حالت میں اسے یا اس کے ہونے والے بچے کو نقصان پہنچے گا تو روزہ نہ رکھے' اور جب یہ عذر ختم ہو جائے تو چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا دے۔ اگر مالی طور پر طاقت حاصل ہو تو ہر روزہ کے ساتھ ایک مُد گندم بھی صدقہ کرے' تاکہ زیادہ ثواب حاصل ہو۔ یہی حکم اُس عورت کے لیے بھی ہے جو بچے کو دودھ پلا رہی ہو اور اسے اپنے آپ کو یا بچے کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اور دودھ پلانے کے لیے دوسری عورت نہ ملے' یا بچہ دوسری عورت کا دودھ پینے سے انکار کرتا ہو۔ اس حکم کی دلیل وہی مذکورہ آیتِ مبارکہ ہے: ﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھ تو سکتے ہیں لیکن ان کے لیے روزہ رکھنا سخت مشقت کا باعث ہے تو اگر وہ روزہ چھوڑ دیں تو قضا دیں اور ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ (۵۸)

نوٹ: ۱) جس نے رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضا دینے میں بلا عذر کوتاہی اور سستی کی' حتیٰ کہ دوسرا رمضان آ گیا اور اس نے ابھی قضا نہیں دی تو اسے چاہیے کہ ہر ایک دن کے روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائے۔

۲) جو شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ روزے باقی ہوں تو اس کا ولی (سرپرست یا قریبی رشتہ دار) اس کی طرف سے روزے رکھے' کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صِيَامٌ صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهٗ)) (۵۹)

''جو شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ کچھ روزے ہوں تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزے رکھے۔''

ایک شخص نے جناب رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا اور کہا:

اِنَّ اُمِّيْ مَاتَتْ وَعَلَيْهَا صَوْمُ شَهْرٍ اَفَاَقْضِيْهِ عَنْهَا؟ فَقَالَ: ((لَوْ كَانَ عَلٰى

۵۸) تفسیر ابن کثیر' تفسیر سورۃ البقرۃ۔

۵۹) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من مات وعلیه صوم۔وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب قضاء الصیام عن المیت۔

أُمِّكَ دَيْنٌ أَكُنْتَ قَاضِيَهُ عَنْهَا؟)) قَالَ نَعَمْ، قَالَ : ((فَدَيْنُ اللّٰهِ اَحَقُّ اَنْ يُقْضٰى)) (٦٠)

''میری والدہ فوت ہوگئی ہیں اور اُن کے ذمہ ایک ماہ کے روزے تھے‘ تو کیا میں اُن کی طرف سے قضا دوں؟'' حضور علیہ السلام نے فرمایا: ''اگر تیری ماں کے ذمہ قرض ہوتا تو کیا تو اُن کی طرف سے اسے ادا کرتا؟'' اس نے کہا: ہاں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تو اللہ کا قرض ادائیگی کا زیادہ حق رکھتا ہے۔''

⑧ روزے کے ارکان‘ سنتیں اور مکروہات

(ا) روزے کے ارکان

۱) نیت: یعنی اللہ کے حکم کی تعمیل کے طور پر یا اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے روزہ رکھنے کا پختہ ارادہ۔ کیونکہ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) (٦١)

''یقیناً عمل نیتوں سے ہوتے ہیں۔''

اگر فرض روزہ رکھنا ہے تو اس کی نیت رات کے کسی حصے میں فجر سے پہلے پہلے کر لینی ضروری ہے‘ کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

((مَنْ لَمْ يُبَيِّتِ الصِّيَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَلَا صِيَامَ لَهُ)) (٦٢)

''جس نے رات سے روزے کی نیت نہیں کی اس کا کوئی روزہ نہیں۔''

البتہ نفلی روزے کی نیت فجر کے بعد بلکہ دن چڑھ آنے کے بعد بھی ہوسکتی ہے‘ بشرطیکہ کچھ کھایا نہ ہو۔ حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں: ''ایک دن رسول اللہ ﷺ میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟'' میں نے عرض کیا جی نہیں۔ فرمایا: ((فَاِنِّیْ

٦٠) صحیح البخاری‘ کتاب الصوم‘ باب من مات وعلیه صوم۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب قضاء الصیام عن المیت۔

٦١) صحیح البخاری‘ کتاب بدء الوحی‘ باب بدء الوحی۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الامارة‘ باب قوله ﷺ انما الاعمال بالنیة وانه یدخل فیه الغزو وغیره من الاعمال۔

٦٢) سنن النسائی‘ کتاب الصیام‘ باب ذکر اختلاف الناقلین لخبر حفصة فی ذلک۔ وجامع الترمذی‘ کتاب الصوم‘ باب ما جاء لا صیام لمن لم یعزم من اللیل۔

صَائِمٌ))(٦٣) ''تب میں روزے سے ہوں۔''

۲) روزہ توڑنے والی چیزوں سے یعنی کھانے پینے اور جماع سے پرہیز کرنا ۔

۳) **وقت**: روزے کا وقت دن سے یعنی صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک ہے۔ اگر کوئی شخص رات کو روزہ رکھے اور دن کو کھول دے تو اس کا روزہ نہیں ہوگا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيۡلِ﴾ (البقرة:۱۸۷)

''پھر رات تک روزہ پورا کرو۔''

ب) روزے کی سنتیں

روزے سے متعلق مندرجہ ذیل اعمال سنت ہیں:

۱) **روزہ جلدی کھولنا**: یعنی جب سورج غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو روزہ کھول دے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيۡرٍ مَا عَجَّلُوا الۡفِطۡرَ)) (٦٤)

''لوگ اُس وقت تک بھلائی پر رہیں گے جب تک روزہ جلدی کھولتے رہیں گے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اِنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن لیصلی المغرب حَتّٰی یفطر ولو علی شربة ماء(٦٥)

''جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز نہیں پڑھتے تھے جب تک روزہ نہ کھول لیتے' اگرچہ پانی کے ایک گھونٹ سے کھولتے۔''

۲) **روزہ کھجور یا پانی سے کھولنا**: تازہ کھجور سے کھولنا زیادہ افضل ہے' پھر خشک کھجور سے' اور سب سے کم درجہ پانی سے کھولنے کا ہے۔ یہ بھی مستحب ہے کہ کھجوریں طاق تعداد میں ___ یعنی تین یا پانچ یا سات ___ کھائی جائیں۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

كَانَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يُفۡطِرُ قَبۡلَ اَنۡ يُصَلِّيَ عَلٰى رُطَبَاتٍ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُنۡ

---

٦٣) صحيح مسلم' كتاب الصيام' باب جواز صوم النافلة بنية من النهار قبل الزوال وجواز فطر الصائم نفلا من غير عذر۔

٦٤) صحيح البخارى' كتاب الصوم' باب تعجيل الافطار۔ وصحيح مسلم' كتاب الصيام' باب فضل السحور وتاكيد استحبابه واستحباب تأخيره وتعجيل الفطر۔

٦٥) طبرانى ۔

eesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj41a.inp 8/20/2014 4:16 PM PAGE 4 (1,1)

رُطَبَاتٌ ، فَتُمَيْرَاتٌ فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تُمَيْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ (٦٦)

''جناب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے سے پہلے چند تازہ کھجوروں سے روزہ کھولتے تھے' اگر تازہ کھجوریں نہ ہوتیں تو خشک کھجوریں لے لیتے' ورنہ پانی کے چند گھونٹ پی لیتے۔''

۳) **روزہ افطار کرتے وقت دعا پڑھنا:** آنحضور ﷺ روزہ کھولتے وقت کہتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْنَا وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْنَا فَتَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ)) (٦٧)

''اے اللہ! ہم نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تیرے دیے ہوئے رزق سے روزہ کھولا' پس تو ہم سے (یہ عمل) قبول فرمالے' یقیناً تو سننے والا جاننے والا ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روزہ کھولتے وقت یہ دعا پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ بِرَحْمَتِکَ الَّتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ اَنْ تَغْفِرَلِیْ (٦٨)

''اے اللہ! میں تجھ سے تیری اُس رحمت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں جو ہر چیز سے وسیع ہے کہ میری مغفرت فرمادے۔''

۴) **سحری کھانا:** یعنی رات کے آخری حصہ میں روزہ رکھنے کی نیت سے کھانا پینا۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فَصْلُ مَا بَیْنَ صِیَامِنَا وَصِیَامِ اَھْلِ الْکِتَابِ اَکْلَۃُ السَّحَرِ)) (٦٩)

''ہمارے روزوں اور اہل کتاب کے روزوں میں امتیاز سحری کھانے سے ہوتا ہے۔''

اور فرمایا:

((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَکَۃً)) (٧٠)

---

٦٦) جامع الترمذی' کتاب الصوم' باب ما جاء ما یستحب علیه الافطار۔ یہ حدیث حسن ہے۔

٦٧) سنن ابی داوٗد' کتاب الصوم' باب القول عند الافطار۔ اس روایت میں یہ لفظ ہیں: اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ۔

٦٨) سنن ابن ماجه' کتاب الصیام' باب فی الصائم لا تردّ دعوته۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

٦٩) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور وتاکید استحبابه واستحباب تأخیره وتعجیل الفطر۔

٧٠) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکة السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور وتاکید استحبابه واستحباب تأخیره وتعجیل الفطر۔

''سحری کھایا کرو' یقیناً سحری میں برکت ہے۔''

۵) سحری میں رات کے آخری حصے تک تأخیر کرنا: جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَزَالُ اُمَّتِیْ بِخَیْرٍ مَا اَخَّرُوا السَّحُوْرَ وَعَجَّلُوا الْفِطْرَ)) (۷۱)

''میری اُمت اُس وقت تک بھلائی پر رہے گی جب تک سحری کھانے میں تأخیر اور روزہ کھولنے میں جلدی کرتی رہے گی۔''

سحری کھانے کا وقت آدھی رات سے شروع ہوتا ہے اور صبح صادق سے ذرا پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

تَسَحَّرْنَا مَعَ النَّبِیِّ ﷺ ثُمَّ قَامَ اِلَی الصَّلَاۃِ قُلْتُ : کَمْ کَانَ بَیْنَ الْاَذَانِ وَالسَّحُوْرِ؟ قَالَ قَدْرُ خَمْسِیْنَ آیَۃً (۷۲)

''ہم نے جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی' پھر حضور ﷺ نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ (راوی کہتے ہیں) میں نے کہا: اذان اور سحری کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ صحابی نے فرمایا: ''جتنی دیر میں پچاس آیتیں پڑھی جائیں''۔

نوٹ : جسے شک ہو کہ ابھی صبح صادق طلوع ہوئی ہے یا نہیں' وہ اُس وقت تک کھا پی سکتا ہے جب تک صبح صادق کے طلوع ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔ اس کے بعد کھانا پینا بند کر دے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَکُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَکُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ص﴾ (البقرۃ:۱۸۷)

''اور کھاتے پیتے رہو حتیٰ کہ تمہارے لیے (فجر کا) سفید دھاگا (رات کے) سیاہ دھاگے سے واضح ہو جائے''۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی نے عرض کی: ''میں سحری کھاتا ہوں' تو مجھے شک ہوتا ہے (کہ صبح صادق ہوگئی ہوگی) تو میں رُک جاتا ہوں''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''جب تک شک کی کیفیت ہو کھاتے پیتے رہو حتیٰ کہ شک باقی نہ رہے''۔ (۷۳)

---

۷۱) مسند احمد۔ حدیث صحیح ہے۔

۷۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب قدر کم بین السحور وصلاۃ الفجر۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور وتاکید استحبابہ واستحباب تأخیرہ وتعجیل الفطر۔

۷۳) مسند ابن ابی شیبۃ۔

meesaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj4la.inp 8/20/2014 4:14 PM PAGE 5 (1,1)

ج) مکروہات

روزے کے دوران کچھ کام مکروہ ہیں۔ یہ کام خود تو روزہ ٹوٹنے کا باعث نہیں ہوتے، لیکن ان کی وجہ سے وہ صورت پیش آ سکتی ہے کہ روزہ ٹوٹ جائے۔ یہ کام مندرجہ ذیل ہیں:

۱) وضو کرتے وقت مبالغہ کے ساتھ کلی کرنا اور ناک میں اچھی طرح پانی چڑھانا: ارشادِ نبویؐ ہے:

((وَبَالِـغْ فِی الْاِسْتِنْشَاقِ اِلَّا اَنْ تَـكُوْنَ صَائِمًا))(۷۴)

''اور ناک میں اچھی طرح پانی چڑھا، مگر اُس وقت نہیں جب تیرا روزہ ہو۔''

آنحضرتﷺ نے روزے کی حالت میں ناک میں مبالغہ کے ساتھ پانی چڑھانا اسی لیے پسند نہیں فرمایا کہ اس سے پانی پیٹ میں چلے جانے کا اندیشہ ہے اور اس سے وضو ٹوٹ جائے گا۔

۲) بوس و کنار: کیونکہ اس سے خواہش بیدار ہو کر خروجِ مذی کا باعث بن سکتی ہے جس سے روزہ ٹوٹ جائے گا۔ بلکہ اس کی وجہ سے جماع تک نوبت پہنچ سکتی ہے جس کی وجہ سے کفارہ دینا لازم ہو جائے گا۔

۳) نظرِ شہوت سے بیوی کو مسلسل دیکھتے چلے جانا۔

۴) مباشرت کے متعلق سوچنا۔

۵) عورت کو ہاتھ سے چھونا اور اس کے جسم سے اپنا جسم لگانا۔

۶) مصطگی (یا چیونگم) چبانا، کیونکہ اس کے اجزاء حلق تک پہنچ سکتے ہیں۔

۷) کھانے یا سالن کا ذائقہ چکھنا۔

۸) بلا ضرورت کلی کرنا۔

۹) صبح کے وقت آنکھوں میں سرمہ لگانا۔ دن کے آخری حصہ میں کوئی حرج نہیں۔

۱۰) سینگی لگوانا اور فصد کھلوانا۔ اس سے ضعف ہو جانے کا خطرہ ہے جس کی وجہ سے روزہ کھولنا پڑے گا۔

---

۷۴) صحیح ابن خزیمۃ۔ انہوں نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ و جامع الترمذی، کتاب الصوم عن رسول اللهﷺ، باب ما جاء فی کراهية مبالغة الاستنشاق للصائم۔

⑨ روزہ کو توڑنے والے کام' اور روزہ میں جائز کام

ا) مندرجہ ذیل صورتوں میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے:

۱) مُنہ کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے جسم میں کسی مائع کا داخل ہونا۔ مثلاً ناک میں دوا ڈال کر' یا آنکھ یا کان میں دوا کا قطرہ ڈالنے سے اس کا جسم کے اندر پہنچ جانا۔ یا حُقنہ کے ذریعے پیچھے کے راستے اور عورت کے آگے کے راستے سے دوا کا جسم میں پہنچنا۔

۲) وضو وغیرہ کے دوران کلی کرتے ہوئے' یا ناک میں اچھی طرح پانی چڑھاتے ہوئے پانی کا پیٹ میں پہنچ جانا۔

۳) بوس وکنار یا مسلسل دیکھنے اور جنسی عمل کا تصور کرنے سے انزال ہو جانا۔

۴) جان بوجھ کر قے کرنا۔ حدیث نبویؐ ہے:

((اَنَّ الصَّائِمَ اِذَا ذَرَعَهُ الْقَیْءُ فَلَا قَضَاءَ عَلَیْهِ وَاِذَا اسْتَقَاءَ عَمْدًا فَلْیَقْضِ)) (۷۵)

''جب روزہ دار کو خود بخود قے آ جائے تو اُس پر قضا واجب نہیں ہے' اور جب وہ جان بوجھ کر قے کرے تو وہ روزہ کی قضا دے''۔

یعنی اگر کسی کو خود بخود بلا اختیار قے آ جائے تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔

۵) کوئی شخص زبردستی روزہ دار کو کھانے پینے یا جماع پر مجبور کر دے۔

۶) کوئی شخص یہ سمجھ کر کھاتا پیتا رہا کہ ابھی صبح صادق نہیں ہوئی' بعد میں معلوم ہوا کہ اُس وقت صبح صادق ہو چکی تھی۔

۷) جس نے یہ سمجھ کر کھا پی لیا کہ سورج غروب ہو گیا ہے' بعد میں معلوم ہوا کہ ابھی دن باقی تھا۔

۸) کسی نے بھول کر کھا پی لیا' پھر یہ سمجھ کر کہ روزہ ٹوٹ چکا ہے اور اب کھانے پینے سے پرہیز ضروری نہیں' بعد میں بھی کھاتا پیتا رہا۔

۹) کوئی ایسی چیز مُنہ کے راستے نگل لی جو کھانے پینے کی چیز نہیں۔ مثلاً موتی یا دھاگا وغیرہ۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

---

۷۵) سنن الترمذی' کتاب الصوم عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فیمن استقاء عمداً۔

meesaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj41a.inp 8/20/2014 4:16 PM PAGE 6 (1,1)

اَلصَّوْمُ مِمَّا دَخَلَ وَلَیْسَ مِمَّا خَرَجَ(۷۶)

''روزہ تو اندر جانے والی چیزوں کا ہے باہر نکلنے والی چیزوں کا نہیں۔''

یعنی روزہ اُس چیز سے ٹوٹتا ہے جو جسم میں باہر سے داخل ہو' مثلاً کھانا پینا' اور اس چیز سے نہیں ٹوٹتا جو جسم سے خارج ہوتی ہے' مثلاً خون یا قے وغیرہ۔

۱۰) دن کے کسی حصہ میں یہ نیت کر لینا کہ اب میں روزے سے نہیں ہوں' اگرچہ کھایا پیا کچھ نہ ہو' بشرطیکہ وہ تأویل کے ساتھ افطار نہ کر رہا ہو۔

۱۱) اگر ایک شخص مرتد ہو جائے اور پھر اسی دن دوبارہ مسلمان ہو جائے تو بھی اس کا وہ روزہ ٹوٹ جائے گا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿**لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ**﴾ (الزُّمر)

''اگر تو نے شرک کیا تو تیرا عمل ضرور ضائع ہو جائے گا اور تو ضرور خسارہ پانے والوں میں شامل ہو جائے گا''۔

مذکورہ بالا تمام امور ایسے ہیں جن سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اُس دن کے بدلے بعد میں روزہ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ البتہ ان سے کفارہ لازم نہیں ہوتا۔ کفارہ صرف دو طرح روزہ ٹوٹنے سے واجب ہوتا ہے:

۱) **بغیر کسی کے مجبور کیے جان بوجھ کر جماع کرنا**: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور بولا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں تباہ ہو گیا''۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تو کیسے تباہ ہو گیا؟'' اس نے کہا: ''میں رمضان میں (روزہ کی حالت میں) اپنی بیوی سے ہم بستری کر بیٹھا''۔ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ''کیا تیرے پاس اتنا مال ہے کہ ایک غلام آزاد کر سکے؟'' اس نے کہا: ''جی نہیں''۔ فرمایا: ''کیا تو مسلسل دو مہینے روزے رکھ سکتا ہے؟'' اس نے کہا: ''جی نہیں''۔ فرمایا: ''کیا تیرے پاس اتنا ہے کہ ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے؟'' اس نے کہا: ''جی نہیں''۔ اس کے بعد وہ آدمی بیٹھ رہا۔ پھر نبی ﷺ کی خدمت میں کھجوروں کا ایک ٹوکرا(۷۷) پیش کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا: ''یہ

---

۷۶) فتح الباری' جلد ٤' صفحہ ١٧٥ بحوالہ ابن ابی شیبة۔ امام بخاری نے اسے تعلیقاً روایت کیا ہے۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب الحجامة القیء للصائم۔

۷۷) حدیث میں ''عَرَق'' کا لفظ ہے جو اتنے بڑے ٹوکرے کو کہتے ہیں جس میں پندرہ صاع (ایک من) کھجوریں آ جائیں۔

لے جا اور صدقہ کر دے''۔ اس نے کہا: ''کیا اپنے سے زیادہ غریب آدمی کو صدقہ دوں' اللہ کی قسم! مدینہ کے دونوں کناروں کے درمیان ہم سے زیادہ اس (ٹوکرے) کا ضرورت مند خاندان کوئی نہیں''۔ نبی ﷺ کھل کر ہنسے' حتیٰ کہ آپؐ کی داڑھیں ظاہر ہوگئیں۔ پھر فرمایا: ((اَطْعِمْهُ اَهْلَكَ))[۷۸] ''جا' اسے اپنے گھر والوں کو کھلا دے''۔

۲) شرعی عذر کے بغیر کھانا پینا: امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اس سے بھی کفارہ واجب ہو جاتا ہے' ان کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں یہ ذکر ہے کہ ایک شخص نے رمضان میں روزہ چھوڑ دیا تو نبی ﷺ نے اسے کفارہ ادا کرنے کا حکم دیا[۷۹]۔ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں نے رمضان میں جان بوجھ کر روزہ توڑ دیا ہے' تو آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

> ((فَاَعْتِقْ رَقَبَةً ...... فَصُمْ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ...... فَاَطْعِمْ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا......))[۸۰]
>
> ''پس ایک غلام آزاد کر' یا (استطاعت نہ ہونے کی صورت میں) دو ماہ کے مسلسل روزے رکھ یا (استطاعت نہ ہونے کی صورت میں) ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے......''

ب) جائز کام

روزہ دار کے لیے مندرجہ ذیل کام مباح ہیں:

۱) دن کے کسی بھی حصہ میں مسواک کرنا۔ البتہ امام احمدؒ نے زوال کے بعد مسواک کرنا پسند نہیں فرمایا۔

۲) گرمی سے بچاؤ کے لیے نہانا' خواہ جسم پر پانی ڈالا جائے یا پانی میں غوطہ لگایا جائے'

۷۸) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب اذا جامع فی رمضان ولم یکن له شیء فتصدق علیه فلیکفر۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب تغلیظ تحریم الجماع فی نہار رمضان علی الصائم ووجوب الکفارۃ الکبریٰ فیه...... الخ

۷۹) موطا امام مالك' کتاب الصیام' باب کفارۃ من افطر فی رمضان۔

۸۰) صحیح البخاری' کتاب النفقات' باب نفقة المعسر علی اهله۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب تغلیظ تحریم الجماع فی نہار رمضان علی الصائم۔

meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj41a.inp 8/20/2014 4:16 PM PAGE 7 (1,1)

ہر طرح جائز ہے۔

۳) رات کے اوقات میں کھانا' پینا اور وظیفۂ زوجیت انجام دینا۔ یہ کام صبح صادق طلوع ہونے سے پہلے تک جائز ہیں۔

۴) کسی جائز ضرورت کے لیے سفر کرنا' جب کہ اسے معلوم ہو کہ سفر کی وجہ سے روزہ چھوڑنے کی ضرورت پیش آ جائے گی۔

۵) کوئی حلال دوا استعمال کرنا' بشرطیکہ وہ پیٹ وغیرہ میں نہ پہنچے۔ ٹیکہ لگوانا بھی جائز ہے' بشرطیکہ اس سے غذا کا فائدہ حاصل نہ ہوتا ہو۔

۶) کھانا چبا کر چھوٹے بچے کے منہ میں ڈال دینا' بشرطیکہ کوئی دوسرا انسان موجود نہ ہو جو یہ کام کر سکے اور بچے کو کھانا کھلانا ضروری ہو۔ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ چبانے والے کے پیٹ میں اس کھانے کا کوئی جز نہ جائے۔

۷) خوشبو لگانا اور سلگائی ہوئی اگر بتی وغیرہ کی خوشبو لینا' کیونکہ شریعت میں اس سے ممانعت وارد نہیں ہے۔

ج) معاف امور

روزہ دار کو مندرجہ ذیل امور معاف ہیں:

۱) اپنا تھوک نگل لینا' اگرچہ زیادہ ہو۔ کسی اور کا لعابِ دہن نہ نگلا جائے۔

۲) خود بخود قے آ جانا' بشرطیکہ زبان تک پہنچنے کے بعد اس کا کچھ حصہ دوبارہ پیٹ میں نہ چلا جائے۔

۳) مکھی کا خود بخود مُنہ میں گھس کر پیٹ میں چلے جانا۔

۴) راستے میں اڑنے والا غبار یا فیکٹریوں وغیرہ کا گرد وغبار' ایندھن کا دھواں اور تمام ایسے بخارات جن سے بچنا ممکن نہ ہو۔

۵) جنابت کی حالت میں صبح ہو جانا' اگرچہ دن بھر اسی حالت میں رہے۔ (اس کا گناہ الگ ہوگا' لیکن روزہ بہرحال برقرار رہے گا۔)

۶) احتلام۔ روزے کی حالت میں اگر نیند میں ناپاک ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ حدیث میں ہے:

((رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَـلَاثَةٍ : عَنِ الْمَجْنُوْنِ الْمَغْلُوْبِ عَلٰى عَقْلِهٖ حَتّٰى يَفِيْقَ

وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَسْتَیْقِظَ وَعَنِ الصَّبِیِّ حَتّٰی یَحْتَلِمَ)) (۸۱)

''تین افراد سے قلم اٹھالیا گیا ہے (ان کے اعمال نہیں لکھے جاتے): دیوانہ جب تک ہوش میں نہ آ ئے' سویا ہوا آدمی جب تک جاگ نہ جائے اور بچہ جب تک بالغ نہ ہوجائے''۔

۷)غلطی سے یا بھول کر کھا پی لینا۔ البتہ امام مالکؒ نے فرض روزہ میں بھول کر کھا پی لینے والے کو احتیاطاً قضا دینے کا فتویٰ دیا ہے۔نفلی روزے میں بالاتفاق اس کے ذمے قضا نہیں۔ارشادِنبویؐ ہے:

((مَنْ نَسِیَ وَھُوَ صَائِمٌ فَأَکَلَ اَوْ شَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَہٗ' فَاِنَّمَا اَطْعَمَہُ اللّٰہُ وَسَقَاہُ)) (۸۲)

''جو روزے کی حالت میں بھول گیا اور اس نے کھا پی لیا تو وہ اپنا روزہ پورا کرلے۔ اسے اللہ تعالیٰ نے کھلایا اور پلایا ہے''۔

ایک حدیث میں ارشاد ہے:

((مَنْ اَفْطَرَ فِیْ رَمَضَانَ نَاسِیًا فَلَا قَضَاءَ عَلَیْہِ وَلَا کَفَّارَۃَ)) (۸۳)

''جس نے رمضان میں بھول کر افطار کردیا (یعنی کچھ کھالیا یا پی لیا) تو اس پر نہ قضا ہے نہ کفارہ''۔

⑩ کفارہ اور اُس کی حکمت

ا) کفارہ

کفارہ اس عمل کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی سے ہونے والا گناہ معاف ہوجائے۔لہٰذا جو شخص شرعی حکم کی مخالفت کرتے ہوئے رمضان کے مہینہ میں دن کے وقت روزہ کی حالت میں اپنی بیوی سے ہم بستر ہوتا ہے یا جان بوجھ کر کھا پی لیتا ہے تو اُس پر ضروری ہوجاتا ہے کہ تین کاموں میں سے کوئی ایک کام کرے تاکہ اس کا گناہ معاف ہو

۸۱) مسند احمد۔و سنن ابی داوٗد' کتاب الحدود' باب فی المجنون یسرق او یصیب حداً۔

۸۲) صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب الصائم اذا اکل او شرب ناسیا۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب اکل الناسی وشربه وجماعه لایفطر۔

۸۳) دارقطنی' کتاب الصیام' باب تبییت النیة من اللیل۔ یہ حدیث صحیح ہے۔

meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\minhaj41a.inp 8/20/2014 4:16 PM PAGE 8 (1,1)

جائے۔ یعنی ایک مؤمن غلام یا لونڈی آزاد کرے‘ یا دو ماہ مسلسل روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ ہر مسکین کو ایک مد(۸۴) گندم‘ یا جو‘ یا کھجور ـــــ جس کی بھی طاقت ہو ـــــ ادا کرے۔ اس کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہے جس میں اس شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جس نے اپنی بیوی سے ہم بستری کر لی تھی اور پھر رسول اللہ ﷺ سے مسئلہ دریافت کیا تھا۔ اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ کام کرلے جن سے کفارہ واجب ہوجاتا ہے‘ اسے ایک سے زیادہ کفارے ادا کرنا پڑیں گے۔ مثلاً ایک شخص نے ایک دن ہم بستری کی اور پھر کسی اور دن عمداً کھاپی لیا تو اسے دو کفارے ادا کرنا پڑیں گے۔

ب) کفارے کی حکمت

کفارے کی حکمت یہ ہے کہ شریعت کا احترام باقی رہے اور لوگ شرعی احکام کی مخالفت کو معمولی بات نہ سمجھ لیں۔ اس کے علاوہ اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ ایک مؤمن نے شرعی حکم کی جو بلا عذر مخالفت کی ہے‘ اس گناہ کے اثرات اس کے دل سے دُور ہو جائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ کفارہ اسی مقدار میں اور اسی انداز سے ادا کیا جائے جس طرح شریعت نے حکم دیا ہے‘ تاکہ اس سے مطلوبہ فائدہ حاصل ہوسکے‘ یعنی اس کا گناہ معاف ہوجائے اور دل سے گناہ کے اثرات کا خاتمہ ہوجائے۔

کفارہ اس اصول کے تحت مقرر کیا گیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا:

﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود: ۱۱۴)

’’بے شک نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں‘‘۔

اور یہی اصول جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس فرمان میں بیان کیا:

((اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ)) (۸۵)

’’تو جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتا رہ‘ اور گناہ کے بعد نیکی کر لے‘ وہ اسے مٹا دے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آیا کر‘‘۔

---

۸۴) مُد کی مقدار دو تہائی سیر یا تقریباً ساڑھے چھ سو گرام ہوتی ہے۔

۸۵) جامع الترمذی‘ کتاب البر والصلة عن رسول اللہ ﷺ‘ باب ما جاء فی معاشرة الناس۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو ’’حسن‘‘ قرار دیا ہے۔

اسلامی معاشرت

اسلامی تمدّن

قرآنی نقطۂ نظر سے

محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیاتِ محمدﷺ'' سے ماخوذ

نبی اکرمﷺ نے اپنے بعد ایسا عظیم الشان تمدن چھوڑا جس نے صدیوں سے عالم کو منور کر رکھا ہے، جس کی صلاحیت اس قدر ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے آپﷺ کا متروکہ تمدن اس کے آخری لمحے تک ضیا پاشی کرتا رہے گا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ قرونِ ماضیہ آپﷺ کی اس میراث کے حقیقی ثمرے اور اس کے نتائج سے کس حد تک بہرہ یاب ہوئے۔ یہ بجائے خود اس امر کی دلیل ہے کہ اس میں مستقبل کو فیض یاب کرنے کی صلاحیت اور بھی زیادہ ہے، اس لیے کہ ختم المرسلینﷺ نے ایسے ''دینِ قیم'' کی بنیاد رکھی جو تمام کائنات کی خوبیوں کا حامل اور ضامن ہے۔

اسلامی تمدن اور مغربی تہذیب کا امتزاج

اس کے مزاج میں ایک خوبی یہ ہے کہ اگر اسے علم صحیح اور عقل سلیم کی آمیزش اور استقامت کے ساتھ مربوط کیا جائے جس کے ساتھ مغربی تہذیب وتمدن کی ان اشیاء سے کام بھی لیا جائے جو اس تمدن (مغربی) کے جزوِ لاینفک کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور اپنی افادیت میں بنی نوعِ بشر کے لیے ضروری ہیں تو قرآن کی تعلیم کے مطابق اسلامی تمدن اور مغربی تہذیب کا یہ امتزاج خود اسلام کی تقویت کا سبب ہوگا۔ اسلام کی فطرت اس قسم کے غور وفکر اور ایسے قوانین دانش وعقل کے درمیان ایسا رابطہ پیدا کر دیتی ہے جس سے مسلمانوں کی ان دونوں (اسلامی اور مغربی تمدن) کے درمیان مناسب رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہی چاہیے، لیکن یہ رابطہ کس طرح پیدا کیا جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک خاص وضع کے مطابق تمدن کی تعریف اور شرح کرتا ہے

nehboobo

G:\Ms_2006\meesaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 1 (1,1)

اور اسی تمدن کی تعریف وتشریح مغرب دوسرے انداز سے کرتا ہے۔ اس لیے دونوں کے تمدن کا اصل جوہر مختلف ہے۔

مغربی تمدن کا خطرناک پہلو انسانی فکر اور حقیقت صحیحہ کے درمیان تفریق ہے

مغربی تمدن کے نتائج میں سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس سے انسانی فکر اور حقیقتِ صحیحہ کے درمیان تفریق کی ایسی خلیج حائل ہوگئی ہے جس کا پُر کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے اور اس غلطی کا سبب اقتصادی نظام کو اساس قرار دینا ہے جو اہل مغرب کے ہر سیاسی کاروبار میں اوّلیت اور اولویت کا درجہ رکھتا ہے۔ ان دونوں کا یہ اختلاف ان کے تاریخی اسباب کا نتیجہ ہے۔ (۱)

ہوا یہ کہ جب مغرب میں ریاست اور کنیسہ دونوں کے درمیان فرق رونما ہوا تو یہ اختلاف اس آخری نقطہ پر جا کر رکا جہاں حکومت اور کنیسہ دو مختلف گدیاں قرار پائیں‘ کیونکہ مغرب کے فکر اور نتائج کی سمتیں بھی متضاد اور مختلف ہی تھیں۔ اِدھر کلیسا کی یہ تمکنت کہ وہ سلطنت پر حاوی ہے اور اُدھر ریاست کو یہ قدغن کہ پوپ اور حکومت دونوں کے درمیان کوئی مذہبی رابطہ نہیں۔ دونوں کی یہ کشمکش مغرب کی سیاست کے ہر جزو وکل میں پائی جاتی ہے۔ مغرب کے ان مفکرین کے نتائج کا ایک مقدمہ یہ بھی ہے کہ عقل محض (''عقل مجرد'') اور عقل عملی (مادیات) دونوں کے درمیان بُعد بعید واقع ہے اور (اہل مغرب کے نزدیک) ان کا موجودہ تمدن عقل عملی (مادیات) ہی کے صدقے میں اس بامِ عروج تک پہنچ سکا ہے۔

مغرب میں اسی مغالطہ کی بنا پر متعدد مفکرین نے تسلیم کر لیا ہے کہ نظامِ عالم بھی اقتصادیات ہی کے کھونٹے پر بندھا ہوا ہے‘ حتیٰ کہ مغرب کے اِن مفکرین میں ایسے افراد بھی پائے جاتے ہیں جو مذہب‘ صنعت وحرفت اور فلسفہ ومنطق میں سے ایک ایک شعبہ کو اقتصادی نظام سے مربوط کرنے کے درپے ہیں‘ تاریخ عالم کے گزرے ہوئے واقعات (اور قوموں کے موجودہ تصادم کے نتائج فتح وشکست) کو بھی اس دور کے اقتصادی حالات کا کرشمہ تصور کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے نزدیک نہ صرف تاریخی حوادث معاشی نظام کی برتری ونکبت کا ثمرہ ہیں بلکہ قوموں کے اخلاق کا انحصار بھی ان کے معاشی نظام کی خوبی وبدنمائی پر ہے۔ ان فلاسفۂ مغرب نے معاشیات کی اس حد تک ہمہ گیری کو علمی تحقیق کا درجہ دے رکھا ہے۔

(۱) مؤلف نے یہ اسباب اس کتاب کے مقدمہ طبع اول ومقدمہ طبع ثانی میں قدرے وضاحت کے ساتھ بیان کر دیے ہیں۔

اہل مغرب کے نزدیک روحانیت صرف انفرادی درجہ تک قابل قبول ہے

مغربی فلاسفہ کے نزدیک روحانی علو (جسے دل کی پاکیزگی اور صفات کی برتری سے تعبیر کیجیے) کو اجتماعیت سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ اسے محض انفرادی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے انفرادی ہونے کی وجہ سے ریاست کو افراد کے اس پہلو سے کوئی واسطہ نہیں۔ مغرب نے اس معاملہ میں یہاں تک آزادی اختیار کر رکھی ہے اور دوسروں کی اس آزادی میں ان کی پاسداری اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ اپنے اصول کو بھی عقیدہ کی آزادی دینے پر محمول کرتے ہیں اور افراد کو ان کے اختیار پر چھوڑے رکھنا ریاست کے فرائض میں سمجھتے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ (فلاسفہ) اس انفرادی مختاریت کو بھی قوم کی اقتصادی برتری ہی کا جزو شمار کرتے ہیں۔

جو تمدن دوسروں کا حق چھیننے کا حریص ہو اُس کا انجام معلوم

لیکن میرے (مؤلف علام کے) عقیدہ کے مطابق جس تمدن کی بنیاد صرف معاشی اصلاح و بہبود اور ترقی پر قائم ہو' اس طرح کہ وہ اخلاقیات کو بھی معاشی سود و منافع ہی کا ثمرہ سمجھے' اس کے ساتھ ہی اخلاقیات کو اجتماعیت کا جزو لازم قرار دینے کی بجائے اسے انفرادی درجہ سے علیحدہ متصور کرنے کا دعوے دار ہو' ناممکن ہے کہ ایسا تمدن انسان کو سعادت اور کامیابی کی حقیقی راہ دکھا سکے' بلکہ ایسے تمدن کا حصول بالآخر قوم کو مصیبت اور تباہی میں مبتلا کر دے گا' جیسا کہ اہل یورپ کی روزمرہ زندگی میں نظر آ رہا ہے۔ جب تک ان کا یہ شعار رہے گا ان کی جنگوں سے دست برداری اور باہمی صلح و صفائی کا وعظ کوئی ثمرہ نہیں لا سکتا' کیونکہ ان میں اصل مسئلہ روٹی کا ہے اور وہ بھی ان میں ہر ایک قوم کی اپنی منشا کے مطابق حل ہونے کا مقتضی۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی اقوام میں سے ہر ایک ملک نے جنگی قوت بھی روٹی ہی کے نام سے بڑھا رکھی ہے' لیکن اصل غرض اپنے لیے روٹی نہیں بلکہ دوسروں کے ہاتھ کا لقمہ جھپٹ لینا ہے۔ ان میں سے ہر ایک طاقت اپنے مقابل کی حکومت کو دشمنی کے سوا کسی اور نظر سے دیکھ ہی نہیں سکتی' جیسے باہم انسانیت کا کوئی رشتہ ہی نہیں۔ ہم گویا انسان بننے کے باوجود حیوانوں کا کردار ادا کر رہے ہیں کہ ہم میں سے ہر ایک قوت کو صرف ذاتی منافع کا احساس باقی رہ گیا ہے اور وہ اخلاقی مبادیات' جن پر ایک دوسرے کی مودّت و محبت کا انحصار ہے' مفقود ہے۔

اشتراکیت اور آمریت دونوں ایک چہرہ کے مختلف روپ ہیں

یورپ میں جو حوادث رونما ہو رہے ہیں وہ ہماری اس توجیہہ اور دعویٰ دونوں کا ثبوت

6\Ms_2006\meesaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 2 (1,1)

ہیں۔ اقوامِ مغرب کی موجودہ رقابت اور مبارزت اسی اقتصادی نظام کی غلط روی کا نتیجہ ہے حتیٰ کہ ان کے تمدن کا ماحصل ایک دوسرے سے جنگ اور دشمنی کے سوا اور ہے ہی نہیں۔ یہ وبا یورپ کے اس طبقہ میں بھی اسی طرح پائی جاتی ہے جو خود کو جدید اشترا کی نظریہ کا عامل بتاتے ہیں اور اس گروہ میں بھی جو اشترا کیت کے دشمن ہیں' یعنی اجارہ دارانِ آمریت۔

جیسا کہ یورپ کی یہ دونوں قسمیں (اشترا کیت پسند اور ان کے مخالف گروہ) ایک دوسرے کے ہاتھ کی روٹی کی تاک میں اس طرح لگے ہوئے ہیں جیسے گدھ مردار کی تاک میں ہو' کہ تمدن کے یہ دعوے دار ایک دوسرے کی دولت چھیننے کے لیے ہمہ وقت فکر مند۔ لطف یہ کہ دونوں گروہ خود کو انسانی حقوق کا محافظ اور اپنے کردار کو ان حقوق کے تحفظ کا پاسبان بتانے میں نہیں شرماتے۔ کاش ان (قوموں) کا یہ رشک و رقابت زندگی کی حفاظت کے لیے ہوتا تو ہم ان کے مبارزہ و رقابت کو بھی طبعی کہتے۔ اسی طرح مختلف اقوام و ملل کا باہمی اختلاف تب اس دلیل کے لیے طبعی اور قابل قبول ہوسکتا ہے جب وہ اپنے مال کی حفاظت کے لیے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو آمریت و اشترا کیت دونوں عقیدوں کے مطابق جنگ کرنا بھی طبعی قرار دیا جا سکتا۔ اب یہ سوال حل طلب ہے کہ قوموں کی باہمی صلح قائم رکھنے اور ان کا جنگوں سے اجتناب دونوں حالتیں کیونکر دائمی اور مستحکم ہوسکتی ہیں۔

موجودہ صدی (بیسویں) کے ثلث اول (از ۱۹۰۱ء تا ۱۹۳۹ء) میں یورپ کی باہمی جنگوں میں جو حوادث رونما ہوئے واضح طور پر ثابت ہے کہ جن کی زندگی کا مبنیٰ محض قومیت ہی رہ گیا ہو' ان قوموں میں دائمی صلح اور پائیدار دوستی کا استحکام خیالی اور ایسی آرزو ہے جس کا تصور بغایت شیریں مگر نتیجہ نہایت تلخ ہو یا محض سراب جو دور سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دے رہا ہو لیکن حقیقت میں چمک دار ریتلے ذروں کا لامتناہی سلسلہ ہو۔

اسلامی تمدن کی بنیاد

مغربی تمدن کے خلاف اسلامی تمدن کی بنیاد میں معنوی حسن زیبائی بدرجۂ اتم موجود ہے جو انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ رابطۂ ادراک پر آمادہ کرتی ہے اور اس پر متوجہ رکھتی ہے کہ وہ خود کو بھی اپنی نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ اس کا یہی ادراک جب ایمان باللہ کی حدود تک جا پہنچتا ہے تب وہ انسان اپنی روحانیت کو شائستہ اور قلب کو مزکیٰ کرنے کا سبب صرف اس جذبہ کو بنالیتا ہے۔ یہی ادراک اس کے لیے عقل و شعور کی ابتدائی غذا مہیا کرتا ہے جس میں فرد خود اخلاقی طور پر سربلند ہو کر اپنے آپ کو انسانی برادری کے ساتھ منسلک اور

محبت واحسان و پرہیزگاری کا منبع سمجھنے لگتا ہے جس کے بعد اپنی زندگی کے اقتصادی معاملات کو اسی محبت واحسان اور پرہیزگاری کے مطابق درجۂ کامل تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام میں اس امر کی اجازت نہیں کہ اخلاقی اقدار کو راہ سے ہٹا کر اقتصادی نظام کے لیے راستہ ہموار کیا جائے۔

اسلامی تمدن کا تصور

اسلامی تمدن کا یہ تصور اس قدر جاذب ومفید ہے کہ تمام انسانی کمالات واوصاف کا کفیل ہو سکتا ہے۔ اگر اسلام کا تمدن دلوں میں بس جائے اور اس کی تنفیذ واجراء کے لیے بھی وہی ذرائع کام میں لائے جائیں جو مغربی نظام تمدن کی ترویج واشاعت میں استعمال کیے جارہے ہیں تو انسانیت کے خدوخال کا نکھار کچھ اور ہی ہو' تمدن کی بنیاد اس انداز سے مستحکم ہو جائے جس سے تمام عالم موجود بحران سے نجات حاصل کر سکتا ہے جو اسے ہر سمت سے گھیرے ہوئے ہیں۔

(موجودہ حالات میں) مشرق ومغرب اس بحران کے استیصال پر ہمہ تن متوجہ ہیں لیکن طریق کار سے بے خبر' اور نہ صرف غیر مسلم ہی بلکہ خود مسلمان بھی ان کے نقش قدم پر گامزن اور ان کے جوش اتباع میں منزل کے صحیح رخ سے بے خبر ہیں۔

میں برملا کہتا ہوں کہ دنیا کے اس بحران کا حل صرف اسلام کے پاس ہے جس کے لیے اہل مغرب اور مشرق کے رہنے والے ہر طرف نظر دوڑا رہے ہیں' لیکن انہیں اتنا قریب دیکھنے کا موقع نہیں ملتا کہ ان کا یہ بحران جو باہمی قتال کا موجب بن رہا ہے نتیجہ ہے ان کی عبادۃ المال کا۔ اس پر طرفہ یہ کہ جب وہ اس بحران کو اپنے موجودہ مذہب عیسویت کا نتیجہ سمجھ کر کسی دوسرے دین کی تلاش میں نظر دوڑاتے ہیں تو ان کی نگاہ ہندومت سے ادھر کہیں نہیں رکتی۔ اسلام کہ جغرافیائی حیثیت سے ہندومت کے گہوارہ (ہندوستان) سے ان (اہل مغرب) کے قریب تر مشرقِ اقصیٰ میں پھیلا ہوا ہے' اہل یورپ اس دین پر توجہ ہی نہیں کرتے جس کے پاس ان کے موجودہ سیاسی ومعاشی بحران کا پورا حل بصورت قرآن موجود ہے مع اس شرح کے جو حامل قرآن ''رسول عربی ﷺ'' کی زندگی کے ہر ہر صفحہ سے ان کی مشکلات میں ان کی رہبر ہو سکتی ہے (یعنی سنت رسول ﷺ)۔

اسلامی نظام تمدن کی مختصر توضیح

اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا جس میں مسیحی مغرب کی طرح کنیسہ اور سلطنت دو مختلف ومتضاد طاقتیں تسلیم کی گئی ہوں۔ جانشینان پیغمبر ﷺ (خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لے کر

6\Ms_2006\meesaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 3 (1,1)

آخری خلیفہٴ راشد تک) نے بھی دینی حیثیت سے کوئی ایسا ضابطہ نافذ نہیں کیا جس سے خود کو مستثنیٰ قرار دیا ہو۔ منصب کی وجہ سے خدا کے نزدیک کسی مسلمان کو دوسرے (مسلمان) پر ترجیح نہیں۔ یہاں تقویٰ و پرہیزگاری قربت کا ذریعہ ہے اور نہ کسی ایسے ولی کی اطاعت ایسے امور میں کسی مسلمان پر واجب جس امر سے خداوندِ عالم کی معصیت کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ جیسا کہ مسلمانوں کے خلیفہٴ اول ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے (اپنے پہلے خطبہ میں) فرمایا:

اُطِیْعُوْنِیْ مَا اَطَعْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ فَاِنْ عَصَیْتُ اللّٰہَ وَرَسُوْلَـہٗ فَلَا طَاعَۃَ لِیْ عَلَیْکُمْ

''(اے مسلمانو!) جس امر میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دوں اس میں تم پر میری اطاعت واجب ہے۔ جس امر میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کی دعوت دوں اس امر میں تم لوگوں پر میری اطاعت واجب نہیں''۔

مگر جب خلافت کی باگ جابر حکمرانوں کے ہاتھ میں آ گئی تو گوناگوں فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کی قوتِ فکر وعمل پر اس کا کوئی اثر نہ پڑ سکا' کیونکہ وہ (مسلمان) آزادیٔ فکر اور قوتِ عقل کو ہر چیز حتیٰ کہ دین و ایمان میں بھی نظرانداز نہیں ہونے دیتے جس کا واضح ثبوت مامون الرشید (عباسی) کے دور سے ملتا ہے' جب ایسے حکمرانوں نے خلیفۃ الرسول کی بجائے خود کو خدا کا نائب ظاہر کرتے ہوئے مسلمانوں کی گردنوں کا مالک بنالیا۔

مامون الرشید کے دور میں عقیدۂ خلق قرآن کی مہم کا تصور کیجیے جس کے خلاف اس نے ہر قسم کے جبر وتشدد کو فرض سمجھ لیا' مگر مسلمانوں نے پورے استقلال و جرأت کے ساتھ مامون کے اس بدعی اور جبری قانون کی مخالفت کی اور اس راہ میں گوناگوں سختیاں برداشت کرنے سے نہ گھبرائے۔

اللہ تعالیٰ نے دین اور ایمان دونوں میں عقل وشعور کو حاکمیت کے مقام پر رکھا ہے۔ سمجھ بوجھ کے بغیر دوسروں کی پیروی کرنا کافروں کا شیوہ ہے۔ اس لیے جو شخص حقیقت اور صحت حقیقت دونوں امور کو نہیں سمجھ سکتا ایسا شخص مؤمن نہیں ہو سکتا۔ ایمان سے یہ مقصود نہیں کہ انسان بھی حیوانوں کی مانند نیکی کی متابعت پر مائل ہو جائے۔ انسانیت کا نتیجہ تو یہ ہے کہ عقل و شعور دونوں کی یک جہتی کے ساتھ علم کی راہ سے ترقی کرے' اس تصور کے ساتھ کہ جس کام کو بہتر سمجھ کر کیا جا رہا ہے وہ (کام) خدا کی رضا کا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح اسے ہر اُس کام سے نفرت اور اجتناب ہو جس کے بدانجام ہونے کا اسے یقین ہے۔

قرآن کریم میں مظاہر قدرت پر غور کرنے کی بے شمار آیتوں میں تلقین کی گئی ہے، جن کے مطالعہ سے اس پر گوناگوں حقائق منکشف ہو سکتے ہیں اور جو (حقائق) بالآخر خالق کائنات پر ایمان لانے کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ خداوند عالم اس (انسان) کی قوت عاقلہ کو فکر و تدبر کے لیے پکار رہا ہے تاکہ (وہ) عقل و دلیل کو اپنا رہبر تسلیم کرے نہ کہ اپنے باپ دادا کی رسوماتِ پارینہ کو پیشوا بنائے رکھے۔

اسرار کائنات پر آگہی کا ذریعہ

مخلوقِ خداوندی کا مطالعہ ایسی دقت نظر سے کیجیے جس کی دعوت علمی طور پر قرآن نے پیش فرمائی ہے، صدرِ اول کے مسلمانوں کی مانند، جن کے طریق تحقیق سے مقصود وہ نہ تھا جو موجودہ یورپ کے پیش نظر ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان تحقیق کے وسیلے سے اس نظم و روش کو منکشف کرے جو خدا نے کائنات کے لیے مزبور فرمائی تاکہ وہ (انسان) خود کو اس نظم کے تابع کر کے زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو، چہ جائیکہ یورپ کا مقصد قدرت کے انہی حقائق کے انکشاف سے محض دنیوی مفاد کی پرورش ہے۔ مگر اسلام ہر وسیلہ و ذریعہ کو صرف خداشناسی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس لیے کہ انسان کو معرفت میں جس قدر وسعت حاصل ہو گی اس کے ایمان و اذعان میں اسی قدر اضافہ ہو گا۔ بالآخر اسی عرفان کی بدولت اسے جماعت کے سود و بہبود کا احساس ہو گا نہ کہ یورپ کی مانند صرف منفعت کا سودا۔

خیال رہے کہ روحانی کمالات کی وسعت انفرادی مصالح کو اپنے دامن میں جگہ نہیں دے سکتی۔ وہ تو مشرق و مغرب حتیٰ کہ چاروں سمتوں کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے۔ اس لیے مادی منافع کو روحانی کمالات پر نثار کر دینا ازبس نفع رساں اور ایسے کمالات کے حصول میں ہر جد و جہد مفید ہے۔ مگر ایسی گراں بہا متاع حاصل کرنے کے لیے محض زبانی قیل و قال کافی نہیں، بلکہ علم کے ساتھ قلب و اذعان کو اس عالی مقصد کے حصول پر متوجہ رکھنا ضروری ہے اور یہ نعمت حضور خداوندی میں استمداد اور قلب و روح دونوں کو پروردگار عالم کے لطف و عنایات کا دست نگر کیے بغیر حاصل ہونا ممکن نہیں، کیونکہ صرف وہی ذات عبادت کی سزاوار ہے اور اسی کی توجہ سے کائنات کے سربستہ راز منکشف ہونے اور زندگی کے طریقے معلوم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ یہی ذریعہ ہے تقرب خداوندی کا جسے ہم اس کی نعمتوں پر اظہار تشکر کے ساتھ حاصل کرنے کے خواہش مند اور اس کے لطف و کرم کے امیدوار ہیں کہ وہ اس منزل پر فائز المرام ہونے میں ہماری دست گیری فرمائے جس منزل سے ہم دور پڑے ہوئے ہیں۔

6\Ms_2006\meesaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 4 (1,1)

اسلام میں عبادات کا فلسفہ

نماز جو تعلق باللہ کا دوسرا نام ہے اور اس مدد و نصرت کی طلب و جستجو سے تعبیر ہے‘ خالی رکوع وسجود اور تلاوت وتکبیر کو نہیں کہتے‘ بلکہ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ جس سے دل میں ایمان ابھرے‘ تقدیس واحترام کے جذبات پیدا ہوں اور عقل وخرد کو اس کی طرف پرواز کے مواقع میسر ہوں۔ تقویٰ کے اعتبار سے تمام انسان احکامِ خداوندی بجالانے میں یکساں نہیں ہو سکتے کہ ہمارے جسم مادیت کی وجہ سے ہماری روحوں پر بھاری رہے آتے ہیں۔ اگر ہم نماز میں رکوع وسجدہ اور قراءت پر اکتفا کر کے دلوں کو خدا کی طرف متوجہ نہ کریں تو یہ مادی اجسام روح کو پژمردہ رکھتے ہیں اور بہیمیت انسان پر غالب آ جاتی ہے جس کے لیے ایسے اعمال ضروری ہیں جو روح کو جسم پر غالب اور انسانیت کو بہیمیت پر مستولی کر سکیں۔ اسلام نے یہ صفت بیدار کرنے کے لیے ہمیں روزہ کی تلقین فرما کر اسے ہمارے مدارج میں ترقی اور تقویٰ میں قوت کا سبب قرار دیا۔

ہم روزہ کی قوت سے آزادیٔ عزم اور حریت فکر بیش از بیش حاصل کر کے اپنی روحانی زندگی بہتر بنا سکتے ہیں‘ مگر ہمارا یہ قول غیروں کے سامنے اس لیے عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں سے روحانیت کی بنیادیں کھود کر ایک طرف پھینک دی ہیں اور قصرِ مادیت کے کنگرے اپنی فوجی قوت کی امداد سے آسمان تک پہنچا رکھے ہیں۔ انسان فکرِ نو کے مطابق دوسروں کے مال اور نفس پر تصرف کا مستحق نہیں‘ صرف اپنی ذات پر اسے اختیار ہے۔ اگرچہ اس کا اختیار عقل اور قانون کے خلاف کیوں نہ استعمال ہو لیکن حقیقت ایسے قانون کے خلاف رہبری کرتی ہے۔

اسی طرح جب ہم اپنے اختیار سے روزہ رکھتے ہیں تو یہ امر منکشف ہو جاتا ہے کہ عقل اگر اسرارِ زندگی کے صحیح معنی سمجھ لے تو خدا کے حکم سے روزہ رکھنا بعید از فہم نہیں اور نہ ایسا روزہ عادت ہی پر ضرب ہے۔ بلکہ وہ عادت کی پابندی سے آزادی دلا کر نہ صرف ہمارے اندر عزم واستقلال اور آزادی کی قوت عطا فرماتا ہے بلکہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اگر انسان روحانی کمالات حاصل کرنے کی غرض سے اپنے اختیار کو اپنی کسی عادت کے خلاف استعمال کرے تو اس سے اس کی قوت فکر میں ایسی استقامت پیدا ہو جاتی ہے جس سے ایمان کی طویل منزلیں آسانی سے طے کر سکتا ہے۔

جب انسان روحانی قوت کی وجہ سے اسرارِ کائنات کے قریب پہنچ جاتا ہے تو اس پر اپنی

اور بنی نوع انسان کی منزلت واضح ہوتی جاتی ہے کہ ہم سب ایک ہی وجود کے مختلف مظاہرات ہیں' تب وہ دوسرے انسان کے ساتھ محبت کرنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے اوراس کے دل میں احساس ابھر آتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کواپنے بھائی کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک سے پیش آنا چاہیے' طاقتور کو ناتواں پر رحم اور توانگر کو نادار کی مالی اعانت کرنا چاہیے۔ پس یہ امداد اگر مقررہ حد (نصاب) تک ہے تو زکوٰۃ اور اگر اس حد سے زیادہ ہے تو صدقہ ہے۔ قرآن مجید نے کئی مقامات پر یکجا زکوٰۃ اور نماز کا تذکرہ فرمایا ہے۔

زکوٰۃ اور صدقہ فرائض اسلام میں سے ایک فریضہ اور دین کا ''رکن'' ہے۔ یہ سوال کہ وہ اجزائے عبادت میں سے ہے یا محض اخلاق وتہذیب کا مظاہرہ' حاشا اللہ زکوٰۃ وصدقہ بھی عبادت ہیں اوراس لیے عبادت ہیں کہ تمام مؤمن ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور مؤمن کا ایمان اس وقت کامل ہوتا ہے جب اسے دوسرے بھائی کے لیے بھی وہی گوارا ہو جسے اپنے لیے پسند کرتا ہے' کیونکہ مؤمن اللہ کے نور کی روشنی میں اپنے بھائی کے ساتھ محبت کا دیوانہ ہے اور فریضۂ صدقہ وزکوٰۃ اس اخوت کو قریب تر کرنے کا وہ ذریعہ ہے جو صرف اخلاق اور معاملہ بندی سے مربوط نہیں رہ سکتا اور ایمان اس عمل سے کامل ہوسکتا ہے جو باہمی اخوت کو مستحکم کرے اور جو ایمان باللہ کی تکمیل کا باعث ہو وہ عبادت ہے۔ یہی عمل ہے جس کی بنا پر زکوٰۃ کو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا گیا۔

اسلام نے صدقہ وزکوٰۃ کو جس جلی عنوان کے ساتھ ایمان کا ایک جزو قرار دیا ہے وہ اپنی ذات میں یہ صلاحیت لیے ہوئے ہے کہ اگر متمدن اقوام اس پر عمل پیرا ہوں تو بنی نوع بشر کے بہبود کا فریضہ خوش اسلوبی سے ادا کرسکتی ہیں۔ بخلاف اس کے مال وزر کو خزانوں میں جمع رکھنے اور دوسروں پر تفوق حاصل کرنے کی تگ ودو میں لگے رہنے کا ثمرہ نہ صرف عوام کی مذلت بلکہ خونریز لڑائیوں کا منبع ہے جو مادہ پرستی کی نحوست کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی کی بدولت اخوت جیسی نعمت یکسر اس سے مُنہ موڑ کر دوسرے بھائی کی دشمنی پر کمر باندھ لی جاتی ہے۔ اگر مادہ پرست غور کریں تو انہیں اخوت انسانی کے سامنے مادیت سے دستبردار ہونے کے بغیر چارہ نہیں رہ سکتا۔ وہ اس مقام پر فائز ہوکر محتاجوں کی دست گیری سے خالق ومخلوق دونوں کی نظر میں ایسے محبوب بن سکتے ہیں جس کے سامنے دولت کے انبار حقیر معلوم ہوں گے۔ کاش! اہل دل خدا پر ایمان لاکر انسانی برادری کا طبعی حق ادا کرسکیں' جس کا اوّلین مظاہرہ محتاجوں کو افلاس سے بچا کر اور مظلوم کو چیرہ دستیوں کی زد سے ہٹا کر اس کی

6\Ms_2006\meesaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 5 (1,1)

حرمت بحال کرنا ہے‘ جیسا کہ دورِ حاضرہ میں خیراتی شفاخانے اور امدادی ادارے کام کر رہے ہیں جن سے انسانی زندگی کا تحفظ اور مفلوک الحال طبقہ کی اعانت مقصود ہے۔ یہی کام اگر برادری اور تشکر نعمت کی صورت میں کیے جائیں تو انسان کو گونہ سکون حاصل ہو اور اس کا یہ فعل کہیں بلند اور اونچا سمجھا جائے۔

اسلام نے برادری کو مستحکم اور برقرار رکھنے کے لیے نہ تو وطنیت کو درخور اعتنا سمجھا اور نہ محبت واخوت کے تقاضوں کو کسی ملک یا کسی قطعۂ زمین میں منحصر جانا۔ اسلام میں محبت حدود نا آشنا ہے۔ چنانچہ اسلامی تعلیم کے مطابق محبت کا دائرہ تمام ربع مسکوں کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے تاکہ خدا کی رضا جوئی کے جذبہ میں ہر شخص دوسرے کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھائے۔ ایسی محبت ایمان باللہ میں ازدیاد کا ذریعہ ہے اور یہی محبت انسانوں کو دور دراز سے کھینچ کر ایک ایسے میدان میں جمع کرنے پر قادر ہے جو اجتماع کے لیے بے مثل مقام ہے جس میں محبت باہمی کا فوارہ ابل رہا ہے۔ یہ بیت اللہ ہے مکہ معظّمہ میں اور مؤمنوں کا یہ اجتماع حج سے موسوم ہے جس (حج) کے لیے ہر مؤمن کی زندگی میں ایک مرتبہ شدّ رحال واجب ہے اس لیے کہ شعائر حج ادا کرنے سے ایمان باللہ میں مزید استقامت پیدا ہو کر انسانی برادری کی قدر و منزلت میں ترقی ہوتی ہے۔

اسلام کے یہ اصول وفرائض حضرت محمدﷺ پر وحی کی صورت میں نازل ہوئے۔ یہی اصول ایمان کے ارکان ہیں جن کا تذکرہ مذکورۃ الصدر آیتوں میں کیا جا چکا ہے اور یہی اصول اسلامی زندگی کی اساس ہیں جن کے بعد ان اخلاقی قوانین کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جن کی بنیاد ایمان ہی ہے جو (اخلاق) ایمان کے شجر میں پھل اور پھول کی شکل میں نمودار ہوئے اور جن کا رنگ و بو دنیا کی کسی متمدن قوم کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔

قرآن نے اخلاقی رواداری کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے سے انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ اصول قرآن کی ایک ہی سورۃ میں نہیں بلکہ متعدد حصوں میں ہیں۔ آپ دنیا کی متمدن سے متمدن قوم کے ہاں اس کا بدل نہ پا سکیں گے بشرطیکہ آپ کے مدنظر یہ ہو کہ جو کردار ایمان باللہ اور تزکیۂ نفس و تعقل کی بدولت حاصل ہو اور جس (اخلاق) سے مادی منفعت مقصود نہ ہو وہ اخلاق انسان کو کس بلندی تک پہنچا سکتا ہے۔

توحید باری تعالیٰ‘ والدین کے ساتھ حسن سلوک‘ غریب اور رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک‘ دولت کے بیجا اسراف‘ قتلِ اولاد اور زنا سے ممانعت‘ حرمت جان‘ یتیم کے مال کی حفاظت‘ ناپ تول میں پیمانے پورے رکھو‘ علم کی پیروی کرو‘ تکبر انسان کے لیے روا

نہیں، دوسروں کو خود پر ترجیح، ایفائے عہد، خوفِ خدا، تکالیف میں صبر، گفتگو میں نرمی، بخل سے اجتناب، فحش باتوں سے پرہیز، کبائر سے اجتناب، عفو وترحم، ناحق بدظنی، منع رشوت، ترکِ فریب، یاوہ گوئی کی مذمت، ہجو کرنے سے نہی، غرض ہر وہ صفت جس کا تعلق تہذیب نفس اور حسنِ کردار کے ساتھ ہے، ان میں سے ایک ایک صفت کو اپنے دامن میں سمویا ہوا ہے۔

اسلامی اور تاجرانہ اخلاق میں فرق

اسلامی نظام میں اخلاقیات کی اساس ایمان باللہ ہے، کیونکہ اخلاق کی نمو و بقا ایمان باللہ کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اسی ایمان باللہ کے پرتو میں روح (انسانی) آلائشوں سے منزہ ہو کر از خود نیکی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے۔ بخلاف ازیں اگر انسان کے سامنے محض مادی منافع اور تبادلہ ہو تو ایسا شخص اخلاق کو بھی حسن معاملت کے ساتھ سودا بازی کے طور پر استعمال کرے گا اور جہاں اپنی منفعت میں خسارہ پائے گا دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنے سے اس کا ہاتھ خود بخود رُک جائے گا، کیونکہ تاجرانہ اخلاق کی تہہ میں جلب منفعت کے سوا کوئی اور مقصود نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ایسے افراد کے دل اور زبان ایک دوسرے سے متفق نہیں ہو سکتے۔ زبان پر حفظ امانت اور ادائے حقوق کے قصائد مگر دل میں مقابل کی جیب کتر لینے کے مسودے! ہاتھ میں ایسی ترازو جس کی تول خریدار کے حق میں سراسر خسارہ مگر اپنا نفع ازل سے مدنظر!

اخلاق کا یہ انداز دور حاضر کے تمدن میں پوری طرح گھل مل گیا ہے۔ بارہا سنا جاتا ہے کہ فلاں شہر میں خلفشار پیدا ہو رہا ہے۔ جب اسباب تلاش کیے جاتے ہیں تو تہہ میں صرف مال و دولت اور جاہ و منصب کی کشمکش ہوتی ہے۔ ان فسادات کی ذمہ داری جن افراد کے سر ڈالی جاتی ہے بظاہر وہی لوگ معاشرہ میں ممتاز اور حسن اخلاق میں سند یافتہ سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کا یہ رکھ رکھاؤ حقیقت میں محض نمائشی ہوتا ہے کہ جہاں سود و زیاں میں کشمکش دیکھی اخلاق کا دامن جھٹک کر منافع کے انبار پر ڈھیر ہو گئے۔ ان میں بعض افراد ایسے چھپے رستم ہیں جو علانیہ خود کو رسوائی سے بچائے رکھتے ہیں مگر در پردہ برائی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور بعض ایسے زود پشیمان کہ اپنی رسوائی کا چرچا عام ہو جانے کے خوف سے خودکشی کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ موجودہ دور تہذیب میں یہ کردار ہر متمدن قوم پر حاوی ہے۔ جس اخلاق کا پس منظر صرف حصولِ منفعت ہو جہاں نفع میں زوال دیکھا دولت اخلاق جواب دے گئی۔

اخلاق بر بنائے ایمان

مگر جو اخلاق قرآنی ہدایت کے مطابق ایمان باللہ اور عقیدہ یعنی اخلاق برائے اخلاق

6\Ma_2006\measaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 6 (1,1)

پر مبنی ہو اُس پر کسی قسم کے خسارے کا خوف مؤثر نہیں ہو سکتا۔ ایسے افراد کا پس منظر حسن نیت ہے جو نفع و نقصان میں یکساں سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے جو شخص لاٹری کا ٹکٹ اس نیت سے حاصل کرتا ہے کہ اس رقم میں سے ایک چیز خیراتی شفا خانہ کی نذر بھی کر دے گا تو ظاہر ہے کہ اس سودے میں خیرات و احسان پیش نظر نہیں بلکہ اپنی منفعت مقدم ہے' ضمناً اس کا ایک جزو شفا خانے کے لیے بھی سہی!

ایسے شخص کے مقابلہ میں ایک کریم النفس ہے' اُن لوگوں کی جستجو میں سرگرداں جنہیں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے میں شرم دامن گیر ہے' مگر حالات کا تقاضا اُن کے حالِ تباہ کی غمازی کر رہا ہے۔ یہ شخص اُن کی دست گیری کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایسے فرد کی خیرات کس قدر حسن نیت پر مبنی ہے!

اسی طرح جو شخص قانون کی زد سے بچنے کے لیے عدالت کے سامنے جھوٹ بولنے سے گریز کرتا ہے مگر دوسرا فرد صدق مقال کی عصمت قائم رکھنے کی خاطر سچی گواہی دیتا ہے' ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔ اس لیے جس اخلاق کی نمائش سود و زیاں کے انداز میں ہو نہ کہ شرفِ انسانیت کی بقا قائم رکھنے کی غرض پر مبنی' تو ظاہر ہے کہ دوسری قسم ایمان باللہ کے بغیر مستحکم نہیں ہو سکتی۔

شراب اور جوئے کی حرمت

قرآن عقل کے صحیح استعمال کا محرک ہونے کی بنا پر ایسے امور سے شدت کے ساتھ منع کرتا ہے جو عقل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور قرآن ایسے امور سے از راہِ ایمان و اعتقاد منع فرماتا ہے۔ ان کاموں میں شراب اور جوا دونوں ایسے مؤثرات ہیں جنہیں قرآن نے ''ناپاک اور شیطانی عمل'' سے تعبیر فرمایا۔ بظاہر اِن دونوں میں منفعت کی جھلک بھی پائی جاتی ہے لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہے جس کی وجہ سے دونوں سے کلیتاً دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

جواری کا دھندا ملاحظہ ہو۔ ضیاعِ اوقات اور اخلاقی قدروں سے تجاوز اس کا نتیجہ ہے۔ اور شرابی کا؟ اِدھر نشہ سر پر سوار ہوا اُدھر حواس الوداع۔ ہوش میں جن امور کو رذیل سمجھ کر ان کے قریب نہ پھٹکتا تھا وہی کام نشے میں مرغوبِ خاطر ہیں۔

قرآن نے جو اخلاقی نظام پیش فرمایا ہے اس میں انسان کے لیے دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کشی نہیں۔ قرآن کا یہ مقصود نہیں کہ انسان کو رہبانیت کے چکر میں گھیر کر اسے اسرارِ کائنات پر غور و فکر کی نعمت سے محروم کر دے' مگر شراب اور جوا انسان کو خواہشوں کا ایسا پرستار

بنا دیتے ہیں جس سے ایسے تصورات ان کی لوحِ فکر سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔
قرآن اعتدال کے ساتھ اخلاقی نظام کی دعوت پیش کر رہا ہے' تاکہ انسان اپنا صحیح موقف حاصل کر سکے' یعنی مسلمان کو ''امۃ وسطی'' بننے کا جو موقع دیا گیا ہے اس کے لیے کوشش جاری رکھے جو شراب اور جوئے ایسے دھندوں میں ڈوبا رہنے سے نہیں مل سکتا۔

قرآن ہمیں کائنات اور مخلوقِ خدا میں غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید فرماتا ہے۔ کبھی ہلالِ نو پر' کبھی شمس و قمر میں' کہیں دن اور رات پر' گاہے زمین اور اس کی پیداوار میں' افلاک اور ان کی آرائش ستارگاں کی طرف' دریاؤں اور ان کے سینے پر تیرنے والی کشتی اور جہازوں پر جو ہمارے سفر اور تجارت کا ذریعہ ہیں' چوپایوں کی حکایت سے جن پر سواری اور ان میں ہماری شان و شوکت کا سامان ہے اور علوم و فنون میں۔ الغرض کائنات کی اَن گنت نعمتوں کا بار بار اعادہ و تکرار' تاکہ ان چیزوں پر غور کر کے ہم مادی منافع بھی حاصل کر سکیں اور ان نعمتوں پر خالق کا شکریہ بھی ادا کر سکیں جن میں عقل کی رہنمائی کے بغیر دسترس ناممکن ہے۔ اور بالآخر یہی غور و فکر اور تعقل ہمارے اقتصادی سود و بہبود پر منتج ہو سکتے ہیں۔

اگر اقتصادی نظام کی اساس اخلاق و شرف پر قائم ہو تو وہ بنی نوع بشر کی آسائش کا صحیح مبنیٰ ہوگی اور انسان کی نحوست کا ستارہ خود بخود ماند پڑ جائے گا۔ قرآن کا یہ نظریہ انسان کو عقیدہ اور ایمان کی قوت سے فضائل اخلاق کی طرف مائل کرتا ہے' تاکہ دنیا بدبختی اور شقاوت سے پاک ہو جائے۔ جو شخص اس نظریہ پر عمل پیرا ہوگا وہ سود جیسی بے برکت تجارت کو جس کے ہاتھ میں موجودہ اقتصادی نظام کی باگ ڈور ہے' ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ کرے گا۔ اسی وجہ سے قرآن نے ربا (جس نے ہر طرف شقاوت پھیلا رکھی ہے) کو قطعاً حرام قرار دیا ہے۔

سود کی حرمت تمدن کا ایسا رکن ہے جس پر تمام عالم کی آسائش منحصر ہے' مثلاً ربا کی ادنیٰ ترین صورت یہ ہے کہ صاحبِ مال خود کوئی مشقت کیے بغیر اپنے مدیون کی کمائی سے ایک معین رقم وصول کر لیتا ہے' اس لیے کہ اس نے غریب کو چند روپے قرض عنایت فرما دیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ دائن خود کاروبار کرنے کی صلاحیت سے معرّا نہ ہوتا تو دوسرے کو اپنی رقم کیوں دیتا؟ (وہ خود کام کر ہی نہیں سکتا) اور کام کی صلاحیت سے محروم ہونے کی وجہ سے اگر اپنا رأس المال دوسرے کو سود پر نہ دیتا تو ایسے نکھٹو کی دولت رفتہ رفتہ تلف ہی تو ہو جاتی۔ بہتر صورت یہ تھی کہ سرمایہ دار متعین منافع مقرر کرنے کی بجائے ایسے محنت کش کے ساتھ سود و زیاں دونوں میں حصہ دار ہوتا۔ سود مدیون کے لیے ایسی مصیبت ہے کہ کاروبار میں خسارہ کی صورت میں غریب کو اصل کے ساتھ سود خوار کی مقررہ شرح بھی ادا کرنا پڑتی ہے اور سود کے اسی نقص کی

6\Ms_2006\meesaq september\ms06-05 mehboob.inp 8/20/2014 4:58 PM PAGE 7 (1,1)

وجہ سے شریعت نے اسے کلیتاً حرام کر دیا۔

جب سود کی معمولی نقصان دہ قسم کا یہ ہولناک نتیجہ ہو تو اس کی دوسری اقسام کا اثر کیا ہو گا؟ مثلاً ضرورت مند نے تجارت کے سوا دوسرے اخراجات یا اہل و عیال کے نان و نفقہ کے لیے سودی قرضہ لیا تو اس کی ادائیگی کہاں تک کر سکے گا ماسوائے ازیں کہ غیب سے کشائش کا امیدوار رہے کہ اگر کچھ ہاتھ لگ جائے تو ادا کر دے۔ قرآن نے قرض کی ادائیگی کو فرض بھی قرار دیا ہے لیکن ایسے مقروض کو کیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا؟ اس قسم کا یہ سود وحشیانہ تو نہیں؟ سود امردم کشی کا مترادف تو نہیں؟ اس قدر معیوب طریقہ کہ مال دار سود کے نام سے لوگوں کے مال ہتھیا لینے کا جرم کرتے ہیں۔ خداوند! ایسا قبیح سرقہ! قانون پر لازم ہے کہ ایسے لوگوں کو چور کی سی سزا دے' بلکہ اس سے بھی زیادہ سزا۔

موجودہ دور کی ہمہ گیر اور مشہور ترین گرفت استعمار سود ہی کا ثمرہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سرمایہ دار ملک کسی غریب خطہ کو تاک لیتا ہے اور اپنے لگے بندھوں میں سے دو دو چار چار دولت مندوں کو اس خطہ میں چپ چاپ بھیج دیتا ہے جو وہاں کے نادار باشندوں کو سودی قرضہ دینا شروع کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ ان کی آمدنی کے ذرائع پر قابض ہو جاتے ہیں۔ جب مقروض طبقہ کروٹ لیتا ہے تو اپنی یہ حالت دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ جونہی لوگ ان پیران تسمہ پا سے نجات کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کرتے ہیں' ان کو بھیجنے والی حکومت اپنی رعایا کے ''تحفظ حقوق'' کا نعرہ لگا کر الٹا اس خطہ پر دوڑ پڑتی ہے اور بالآخر ان کا تسلط قائم ہو جاتا ہے۔ اب اس سے اس خطہ کے باشندے اور قدیم حکمران ان بیاجیوں کو بھیجنے والوں کی رعایا اور وہ ان کے بادشاہ بن جاتے ہیں جس کے بعد ملک کے اصلی باشندوں کی غیرت بے حیائی سے بدل جاتی ہے اور ایمان غفلت کی نذر ہو کر برسوں کے لیے منہ ڈھانکے پڑا رہتا ہے۔ لیکن جو قومیں زوال و نکبت کے مآل کو سمجھتی ہیں وہ سودی قرضہ کا لین دین کرنے سے دور رہ کر اپنے ایمان اور مآل دونوں پر خود ہی قابض اور مسلط رہتی ہیں۔

''استعمار'' جنگوں کا مصدر اور شقاوت کا ایسا بوجھل طومار ہے جس کے بوجھ تلے آج انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ یہ سود کا پروردہ ہے۔ سود اور یہ دونوں جور و ظلم کی تیغ براں۔ جب تک دونوں میں سے ایک کا ہیولیٰ موجود ہے انسان محبت اور اخوت کا منہ نہیں دیکھ سکتا اور اس کا استیصال اس وقت تک ناممکن ہے جب تک معاشرہ قرآنی بنیادوں پر قائم نہ ہو' وہ قرآن جو وحی کی صورت میں نازل ہوا۔

(اخذ و ترتیب: حافظ محبوب احمد خان)

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (35)

تُرکی (۳)

(TURKEY)

تحقیق و تحریر: سید قاسم محمود

تیسرا دَور

(1520ء تا 1700ء)

سلیمان اعظم (1520ء تا 1566ء)

سلیم اوّل کے بعد اس کا لڑکا سلیمان اوّل قانونی 26 سال کی عُمر میں تخت نشین ہُوا۔ وہ ہندوستان میں مغل بادشاہ بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کا ہم عصر تھا۔ اُس کے 46 سالہ دَور میں سلطنتِ عثمانیہ نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ عثمانی سلاطین میں وہ سب سے باعظمت حکمران ہُوا ہے۔ آلِ عثمان میں اُس کا وہی مقام ہے جو سلجوقی سلطنت میں ملک شاہ کا اور سلطنتِ مغلیہ میں اورنگ زیب عالمگیر کا مقام ہے۔ اُسے بجا طور پر سلیمان اعظم کہا جاتا ہے۔ اہل یورپ اُسے ''ذی شان'' کے لقب سے یاد کرتے تھے، لیکن ترک اُس کو ''سلیمان قانونی'' کہنا پسند کرتے ہیں۔

سلیمان ذی شان نے 1521ء میں بلغراد کا شہر فتح کیا۔ اُس سے اگلے سال جزیرہ رھوڈس میں مسیحی سورماؤں سے لے لیا۔ یہ دونوں مقام وہ تھے جن کو فتح کرنے میں محمد فاتح ناکام رہا تھا۔ 1526ء میں یعنی جس سال بابر نے ابراہیم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی، اُسی سال سلیمان اعظم نے ہنگری کی فوج کو شکست دے کر بوداپست پر قبضہ کرلیا۔ 1529ء میں آسٹریا کے دارالحکومت ویانا کا محاصرہ کیا، لیکن بھاری توپیں نہ ہونے کی وجہ سے محاصرہ کامیاب نہ ہوسکا۔ 1532ء میں سلیمان کے فوجی دستوں نے آسٹریا اور جرمنی میں داخل ہوکر دُور دُور تک چھاپے مارے اور یورپ کی متحدہ قوّت کو شکست دے کر، جس کی قیادت یورپ کا سب سے بڑا

E:\Meesaaq_2006\Ma_2006\meesaq september\ms-turki-3.inp 8/20/2014 5:16 PM PAGE 1 (1,1)

حکمران چارلس پنجم کر رہا تھا‘ 1533ء میں آسٹریا کو صلح کرنے اور خراج دینے پر مجبور کر دیا۔

مشرق میں سلیمان نے 1534ء میں ایرانیوں سے بغداد چھین لیا اور عراق کو سلطنت عثمانیہ کا مستقل صوبہ بنا دیا۔ ایران سے لڑائیوں کے دوران عثمانی فوجیں اصفہان تک پہنچ گئی تھیں اور آذربائیجان اور آرمینیا پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ 1538ء میں یمن اور عدن پر عثمانی بالادستی قائم ہوئی۔ طرابلس اور الجزائر سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوئے۔ تونس پر امیر البحر خیر الدین باربروسہ نے 1534ء میں قبضہ کر لیا تھا‘ لیکن چارلس پنجم نے پھر واپس لے لیا اور یہ علاقے سلیمان اعظم کی وفات کے بعد سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوئے۔

امیر البحر خیر الدین باربروسہ (1483ء تا 1546ء)

سلیمان اعظم کے زمانے میں عثمانی ترکوں کی بحری طاقت بھی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ عثمانی بحری بیڑے نے نہ صرف بحیرۂ ایجین کے جزیرے فتح کیے بلکہ اٹلی‘ فرانس اور اسپین کے ساحلوں تک چھاپے مارے۔ بحرِ ہند میں ترکوں نے مشرقی افریقہ کے ساحل اور ہندوستان میں گجرات تک بحری مہمیں روانہ کیں۔ یہ مہمیں پرتگالیوں کے خلاف تھیں جو ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کرنے کے بعد افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں لُوٹ مار اور غارت گری کرتے رہتے تھے۔ خیر الدین باربروسہ‘ پیالہ پاشا‘ پیری رئیس‘ طورغوز‘ سدی علی اِس دَور کے مشہور جہاز ران اور امیر البحر تھے۔

خیر الدین باربروسہ ترکوں کا سب سے بڑا امیر البحر تھا۔ اُس زمانے میں بحیرۂ روم میں وینس‘ جینوا اور ہسپانیہ کی بحری طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی‘ لیکن خیر الدین نے اِن ملکوں کے متحدہ بحری بیڑے کو 1538ء میں پریولسا کی مشہور بحری جنگ میں شکست دے دی۔ خیر الدین نے فرانس کے شہر طولون پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور اُس نے ہسپانیہ کے ساحلی علاقوں کو کئی مرتبہ تاراج کیا اور وہاں سے ستر ہزار مظلوم مسلمانوں کو نکال کر شمالی افریقہ پہنچایا۔ الجزائر خیر الدین ہی کی کوششوں سے سلطنت عثمانیہ میں شامل ہوا۔ خیر الدین پاشا کی قبر دار السلطنت استنبول کے پاس بحیرۂ باسفورس کے کنارے پر ہے۔ اُس کے انتقال کے بعد جب بھی کوئی بیڑہ لڑائی پر جاتا تھا تو قبر کے پاس سے سلامی دیتا ہوا گزرتا تھا۔

سلیمان اعظم کی فتوحات اِس وجہ سے بھی بڑی اہم ہیں کہ اُس نے ایک ایسے زمانے میں اپنی سلطنت کو وسعت دی کہ جب یورپ میں بیداری پیدا ہو گئی تھی اور وہاں بڑی بڑی اور طاقتور حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ فرانس کا بادشاہ فرانسس‘ انگلستان کی ملکہ الزبتھ اور ہسپانیہ کا حکمران چارلس پنجم اُس زمانے میں یورپ کے سب سے طاقتور حکمران سمجھے جاتے تھے۔ سلیمان نے اِن سب کی موجودگی میں سلطنت کو وسعت دی۔ وہ وسط یورپ کو بھی فتح کرنا چاہتا تھا اور اِس سلسلے میں اُس نے آسٹریا کے دار الحکومت ویانا کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ویانا کو تو سلیمان فتح نہ کر سکا‘ لیکن آسٹریا کو خراج دینے پر مجبور کر دیا‘ حالانکہ ہسپانیہ کا شہنشاہ چارلس پنجم خود مقابلے پر آیا تھا۔

سلیمان کی قواعد داں فوجیں جدید ترین اسلحے سے آراستہ تھیں اور اتنی طاقتور تھیں کہ سلیمان اُن کے ذریعے یورپ کا بہت بڑا حصہ فتح کر لیتا‘ لیکن ایران سے لڑائیوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔ جب بھی وہ

یورپ کا رُخ کرتا تھا' ایرانی فوج مشرق سے سلطنت عثمانیہ پر حملہ کر دیتی تھی اور سلیمان کو اپنی یورپی مہم چھوڑ کر ایران کے مقابلے پر آنا پڑتا تھا۔ یورپ کی حکومتوں نے ایران سے تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ وہ اس کو عثمانی سلطنت کے خلاف اُکساتی رہتی تھیں۔ آسٹریا کا ایک سفیر کہا کرتا تھا:

''ہماری مکمل تباہی اور عثمانی سلطنت کے درمیان ایران حائل ہے''

سلیمان اعظم جتنا اپنی فتوحات کی وجہ سے منفرد وممتاز ہے' اُتنا ہی منفرد وممتاز قابلیت اور حسنِ کردار کی وجہ سے بھی ہے۔ اُس نے محمد فاتح کے بنائے ہوئے قوانین میں ترمیم اور اصلاح کی اور کئی نئے قوانین بنائے۔ اِن قوانین کی وجہ سے وہ ترکوں میں ''سلیمان قانونی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے جو زرعی اصلاحات کیں' اُن کی وجہ سے کسانوں کی حالت یورپ والوں کے لیے قابلِ رشک بن گئی تھی۔ آسٹریا اور ہنگری کے ہزاروں کسان اپنا ملک چھوڑ کر سلطنت عثمانیہ میں آباد ہو گئے تھے۔

سلیمان اعظم کے کارنامے

سلیمان اعظم ترکی اور فارسی کا شاعر بھی تھا۔ اُس نے عثمانی خاندان میں علوم وادبیات کی سب سے زیادہ سرپرستی کی۔ ترکی زبان کے صف اوّل کے شاعر فضولی اور باقی اُسی کے عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابو سعود آفندی اور ابراہیم حلبی اُس زمانے کے مشہور فقیہہ اور عالم دین تھے' جنہوں نے قانون سازی میں سلیمان کی بڑی مدد کی۔ اُس کے عہد میں مدرسے اور کتب خانے کثرت سے قائم کیے گئے۔

علم وادب کی سرپرستی کے علاوہ سلیمان اعظم کے زمانے میں عالیشان عمارتیں بھی کثرت سے تعمیر ہوئیں۔ سنان فن تعمیر کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اُس نے تین سو سے زیادہ عمارتیں تعمیر کیں۔ ان میں مسجدیں' محل' سرائیں' پُل' مدرسے اور شفاخانے سب شامل ہیں۔ یہ عمارتیں سلطنت کے تمام اہم شہروں میں بنائی گئیں۔ اِس عہد کی سب سے خوبصورت اور عظیم الشان تعمیر ''جامع سلیمانیہ'' ہے جو نہ صرف استنبول کی سب سے خوبصورت مسجد ہے' بلکہ اس کا شمار پوری دنیا کی حسین وجمیل مساجد میں ہوتا ہے۔

سلیمان اعظم ایک عادل اور انصاف پرور سلطان تھا۔ انصاف وعدل کے معاملے میں وہ کسی کی رُو رعایت نہ کرتا تھا۔ اُس کے داماد فرہاد پاشا کا واقعہ سلیمان اعظم کی انصاف پسندی کا بہترین ثبوت ہے۔ فرہاد پاشا ایک صوبے کا حاکم تھا۔ وہاں لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور اُن سے رشوت لیتا تھا۔ سلیمان کو جب اس کا پتا چلا تو اُس نے فرہاد پاشا کو فوراً معزول کر دیا۔ بعد میں فرہاد پاشا کی بیوی نے' جو سلیمان اعظم کی بیٹی تھی' بڑی التجاؤں کے بعد اُس کو بحال کرا دیا' لیکن جب فرہاد پاشا نے پھر وہی ظلم' رشوت ستانی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کیا تو سلیمان نے نہ صرف اُس کو معزول کر دیا بلکہ قتل کرا دیا۔

اپنی اِن تمام خوبیوں اور کارناموں کے باوجود سلیمان اعظم وہ بلند مقام حاصل نہ کر سکا جو ہم عُمر ابن عبدالعزیز' نورالدین زنگی' صلاح الدین ایوبی یا اورنگ زیب عالمگیر جیسی جلیل القدر ہستیوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ البتہ سلیمان ایک اچھا بادشاہ تھا' جیسے ہارون الرشید' مامون الرشید' ملک شاہ سلجوقی وغیرہ تھے۔ وہ ایک مطلق العنان بادشاہ تھا' جمہوری حکمران نہیں تھا۔ اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرتا تھا' ہر معاملے کو مجلس مشاورت میں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے لوگوں کے بہکانے

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaq september\ms-turki-3.inp 8/20/2014 5:16 PM PAGE 2 (1,1)

سے محض شبے کی بنیاد پر اپنے ایک بیٹے مصطفیٰ اور اپنے سب سے اچھے وزیر اعظم ابراہیم کو قتل کرا دیا تھا۔

سلیمان اپنے عہد میں اور اپنی زندگی میں دنیا کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ اُس کے ہم عصر اکبر نے یقیناً ایک بڑی سلطنت قائم کی جو مستحکم بھی تھی، لیکن سلیمان کی زندگی میں اکبر کی حکومت زیر تشکیل تھی، پوری طرح عروج پر نہ آئی تھی۔ اُس کے عہد کے حکام میں خسرو بیگ (وفات 1542ء) کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بوسنیا کے گورنر رہے۔ انہوں نے بوسنیا اور سلطنت عثمانیہ کے دوسرے علاقوں میں تین سو سے زیادہ مسجدیں، مدرسے، حمام اور مسقّف بازار تعمیر کرائے۔ نیکی اور کارِ خیر کی کثرت کی وجہ سے ترک اُن کو ایک ولی تصوّر کرتے ہیں۔ بوسنیا کے شہر سراجیو کے لوگوں کو اُن کی ذات سے بہت فائدہ پہنچا۔ وہاں اُن کا مزار آج بھی عقیدت مندوں کی زیارت گاہ ہے۔

محمد پاشا صوقوللّی

سلیمان ذی شان قانونی کے بعد آلِ عثمان میں کچھ مدت کے لیے قابل اور باصلاحیت بادشاہوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اُس کا لڑکا سلیم دوم (1566ء تا 1574ء) حکومت کرنے کی صلاحیت سے محروم تھا، لیکن خوش قسمتی سے اُس کو ایک قابل وزیر مل گیا جس کا نام محمد پاشا صوقوللّی تھا۔ وہ سلیمان کے زمانے سے وزیر چلا آ رہا تھا اور اُس نے 1564ء سے 1578ء تک چودہ سال ایک حقیقی حکمران کی طرح حکومت کی۔ اُس کے عہد میں 1570ء میں قبرص اور 1574ء میں تونس فتح ہوئے۔ اور 1577ء میں جب پرتگالیوں نے مراکش پر حملہ کیا تو سلطان مراکش کی درخواست پر الجزائر کے عثمانی والی رمضان پاشا نے فاس پہنچ کر پرتگالیوں کو شکست دی اور مراکش کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔

محمد پاشا کے زمانے کا ایک افسوس ناک واقعہ لپانٹو کی بحری جنگ ہے۔ اِس جنگ میں یورپ کے متحدہ بیڑے نے، جو قبرص کو ترکوں سے واپس لینے کے لیے آ رہا تھا، 1571ء میں ترکوں کا تقریباً پورا بحری بیڑہ تباہ کر دیا۔ اِس جنگ میں ترکوں کے دو سو جہاز یا تو تباہ ہو گئے یا پکڑے گئے اور بیس ہزار ترک فوجی شہید ہوئے۔ اس شکست کے بعد جب وینس کا سفیر محمد پاشا سے ملا تو پاشا نے اُس سے کہا:

> ''تم نے ہمارا بیڑہ تباہ کر کے صرف ہماری داڑھی کاٹ دی ہے جو پھر آ جائے گی، لیکن ہم نے قبرص ہتھیا کر تمہارا بازو کاٹ دیا ہے جو پھر جوڑا نہیں جا سکتا۔''

اِس شکست کے بعد محمد پاشا نے اولوج علی رئیس کو قلیج علی پاشا کا لقب دے کر نیا امیر البحر بنایا اور اُس کو نیا بیڑہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس موقع پر امیر البحر نے محمد پاشا سے کہا: ''پاشا ہماری سلطنت ایک ایسی سلطنت ہے کہ اگر وہ چاہے کہ بیڑے کے اسطول چاندی کے، رسیاں ریشم کی اور بادبان اطلس و کمخواب کے بنا دیے جائیں تو یہ بھی ممکن ہے۔''

چنانچہ چند ماہ کے اندر دو سو جہاز بن کر تیار ہو گئے اور بحیرۂ روم میں حسبِ سابق عثمانی بیڑے کی سیادت قائم ہو گئی، تونس کو لپانٹو کی جنگ کے بعد ہی قلیج علی رئیس نے فتح کیا۔ سماترا کے مسلمان حکمران کی درخواست پر پرتگالیوں کے خلاف ایک بحری مہم بھی اِس حادثے کے بعد ہی بھیجی گئی۔ سلطنت عثمانیہ صحیح

معنوں میں سلیمان قانونی کے زمانے میں نہیں' بلکہ محمد پاشا کے زمانے میں اپنے نقطۂ عروج پر پہنچی۔ محمد پاشا کو 1578ء میں درباری سازشوں کے نتیجے میں قتل کر دیا گیا۔

مُراد چہارم

محمد پاشا صوقوللی کے بعد سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہوگئیں۔ رشوت خوری اور بدعنوانیاں پھر عام ہوگئیں۔ درباری سازشیں شروع ہوگئیں اور حکومت میں عورتوں کا عمل دخل بڑھ گیا۔ تقریباً ستر سال تک یہی حالت رہی۔ اس طویل عرصے میں سوائے مراد چہارم (1623ء تا 1640ء) کے اور کوئی قابل حکمران پیدا نہیں ہوا۔ مراد چہارم بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا۔ نوعمری کی وجہ سے سلطنت کا انتظام اُس کی ماں کے سپرد تھا جو والدہ سلطانہ ماہ پیکر کے نام سے مشہور ہے۔ اُس نے مُراد کی نوعمری کے زمانے میں بڑی قابلیت سے حکومت کی۔ مُراد نے تخت نشین ہونے کے آٹھ سال بعد سلطنت کا انتظام خود سنبھالا اور اصلاحات کیں' لیکن وہ صرف آٹھ سال حکومت کر سکا۔ اس کے بعد پھر خرابیاں پیدا ہوگئیں' لیکن جلد ہی ایک شخص محمد کوپریلی نے گرتی ہوئی حالت کو درست کیا۔

محمد کوپریلی (1656ء تا 1661ء) ایک معمولی شخص تھا اور سلطان کے مطبخ میں کام کرتا تھا۔ وہ بھی شیر شاہ سُوری اور المنصور عباسی کی طرح حیرت انگیز قابلیت کا مالک تھا۔ وہ اَن پڑھ تھا' لیکن اس کے باوجود اتنی ترقی کی کہ دمشق اور طرابلس کا والی ہوگیا اور جب سلطنت عثمانیہ کی حالت بہت خراب ہوگئی تو سلطان نے اُس کو وزیر اعظم بنا کر سارے اختیارات دے دیے۔ محمد کوپریلی پانچ سال وزیر رہا' لیکن اُس نے اِس مختصر مدت میں ساری خرابیاں دُور کر دیں اور امورِ سلطنت میں جان ڈال دی۔

احمد کوپریلی (1661ء تا 1676ء)

محمد کوپریلی کے بعد اُس کا لڑکا احمد کوپریلی وزیر اعظم ہوا۔ جس وقت وہ وزیر اعظم ہوا' اُس کی عمر صرف 29 سال کی تھی۔ باپ نے اس کو اپنی نگرانی میں نظم ونسق کی تعلیم دی تھی۔ بیٹا باپ سے بھی زیادہ قابل نکلا۔ اُس کے عہد میں جو کارنامے انجام دیے گئے' اُن کی وجہ سے وہ سلطنتِ عثمانیہ کا سب سے بڑا وزیر اعظم سمجھا جاتا تھا۔ احمد کوپریلی بڑا خوش اخلاق اور منکسر مزاج تھا۔ اُس کی خوبیوں کی وجہ سے لوگ اُس کے گرویدہ رہتے تھے۔ وہ شرعی احکام کی پابندی سختی سے کرتا تھا۔ احمد کوپریلی کے کردار کا سلطنت کے دوسرے وزیروں اور عہدے داروں پر بھی اثر پڑا اور انہوں نے بھی اپنی اصلاح کی۔

احمد کوپریلی نے پندرہ سال وزارت کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے۔ اِس عرصے میں اُس کو کئی لڑائیوں میں حصہ لینا پڑا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اہلِ یورپ بڑی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔ اب وہ سائنس میں بھی مسلمانوں سے آگے بڑھ گئے تھے اور تہذیب وتمدن میں بھی مسلمانوں کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔ روس' پولینڈ' فرانس' انگلستان اور آسٹریا میں بڑی طاقتور حکومتیں قائم ہوگئی تھیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کی وجہ سے یورپ والے ایسے نئے اور کارگر ہتھیار استعمال کرنے لگے تھے جو اب عثمانیوں اور دوسرے ملکوں کے مسلمانوں کے پاس نہیں تھے۔ اُن کی فوجوں کی تنظیم وتربیت بھی اب

E:\Meesaaq_2006\Ms_2006\meesaaq september\ms-turki-3.inp 8/20/2014 5:16 PM PAGE 3 (1,1)

عثمانیوں سے بہتر ہوگئی تھی۔ عثمانیوں نے سلیمان اعظم کے بعد سے عسکریات میں کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ وہ اب تک روایتی ہتھیار استعمال کرتے تھے۔

احمد کوپریلی کو پولینڈ' آسٹریا اور فرانس سے لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان لڑائیوں میں اُسے بے پناہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ احمد کوپریلی دو لڑائیوں میں شکست کھا گیا۔ ان میں ایک لڑائی سینٹ گوتھرڈ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام آسٹریا میں ہے' اور یہاں 1664ء میں آسٹریا کی فوجوں سے' جن کی مدد کے لیے فرانسیسی فوج آئی ہوئی تھی' ترکوں کی جنگ ہوئی اور ترکوں کو کثرتِ تعداد کے باوجود شکست ہوئی' لیکن اِن شکستوں کا عثمانی سلطنت پر کوئی غلط یا بُرا اثر نہیں پڑا۔ احمد کوپریلی نے دو لڑائیاں ہارنے کے باوجود پولینڈ سے پوڈولیا کا صوبہ لے لیا اور آسٹریا سے بھی کئی اضلاع حاصل کر لیے اور تاوانِ جنگ وصول کیا اور رُوس کے علاقے یوکرین پر عثمانی سادات قائم کر لی۔ بحری کارروائیوں میں احمد کوپریلی کا سب سے بڑا کارنامہ جزیرہ کریٹ کی فتح ہے۔ اس جزیرے پر 1669ء میں ترکوں کا قبضہ ہوا۔ اس کے عہد میں جو فتوحات ہوئیں وہ سلطنتِ عثمانیہ کی آخری فتوحات تھیں۔ اُن کے بعد عثمانی سلطنت میں کسی علاقے کا اضافہ نہیں ہُوا۔

ان فتوحات کے علاوہ اندرونِ ملک میں احمد کوپریلی نے جو اصلاح کی' اُس کی وجہ سے اس کی عظمت اور بڑھ گئی۔ اُس نے ملک کے اندر امن و امان قائم کیا۔ محصول ہلکے کر دیے۔ عوام کو ظالم جاگیرداروں کے ظلم سے نجات دلائی۔ سلطنت کا مالی انتظام اتنا اچھا کیا کہ خزانہ بھر گیا۔ اُس نے رعایا کے تمام طبقوں کی سرپرستی کی۔ عیسائیوں کے گرجوں کی تعمیر پر سے پابندیاں اٹھا دیں' جس کی وجہ سے عیسائی اُس سے خوش ہو گئے۔

1676ء میں یہ مقبول وزیراعظم' جو اورنگ زیب عالمگیر کا ہم عصر تھا' اس دنیا سے چل بسا۔ انتقال کے وقت اُس کی عُمر اکتالیس سال تھی۔ پندرہ سال کے عہدِ حکومت میں احمد کوپریلی نے جو کارنامے انجام دیے' ترکی کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔

زمانۂ عروج کا خاتمہ

احمد کوپریلی کے بعد ایک شخص قرہ مصطفیٰ وزیراعظم ہوا' لیکن اُس شخص میں حکومت کی اہلیت نہیں تھی۔ اُس نے 1683ء میں ویانا کا محاصرہ کیا' لیکن اُس میں ناکامی ہوئی۔ یورپ کی حکومتیں ایسے موقع کا انتظار کر رہی تھیں کہ جس سے ترکوں کی کمزوری ظاہر ہو۔ ویانا کے محاصرے میں ناکامی سے یہ موقع اُن کو مل گیا۔ چنانچہ رُوس' آسٹریا' وینس اور پولینڈ نے مل کر سلطنت عثمانیہ پر ہر طرف سے حملہ کیا۔ ترک کئی سال تک اُن کا مقابلہ کرتے رہے' لیکن بالآخر اُن کو شکست ہوئی اور 1699ء میں کارلووٹز کے مقام پر ایک معاہدہ ہوا جس کی رُو سے ہنگری ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اِس معاہدے کے ساتھ ہی سلطنتِ عثمانیہ کا زمانۂ عروج ختم ہوا۔ (جاری ہے)